5-12-

Title - JAWAHARAAT-E-NASR. YAANI MEER AMM
LEKAR MAUJOODA ZAMANE TAK URDU KE BE
INSHA PAR DAZON KI NASR KE NAMOONE

Creator - Murattiba Sayyed Mohammad Makhmoor Ak

Publisher - National Press (Allahabad).

Date - Not Available

Pages - 234

Subjects - Urdu Adab - Intikhab Nasr.

جواہرات نثر

مرتبہ۔ مخمور اکبرآبادی

جواہرات نثر

یعنی

میر امن سے لے کر موجودہ زمانہ تک اُردو کے بہترین انشا پردازوں کی

نثر کے نمونے

مرتبہ

سید محمد محمود رضوی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی مخمور اکبر آبادی

حسب فرمائش

رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش آگرہ

نیشنل پریس الہ آباد میں چھپا

(حقوق محفوظ)

باسمہٖ

دیباچہ

دُنیا کی دوسری زبانوں کے برخلاف اردو زبان کی ابتدا نظم سے ہوئی ہے
اس لئے اس میں ادبِ منظوم خصوصاً غزلیں کثرت سے موجود ہیں۔ نثر کی جانب چونکہ
بہت دیر میں میلان ہوا اسلئے نثر کی تصنیفات نسبتاً بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کے
منتخبات کے مجموعے اکثر دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر نثر کا کوئی اس قسم کا مجموعہ نہیں ہے
نثر کی ترقی چونکہ جدید ہے اس لئے مستند نثار تعداد میں بھی کم ہیں۔ اور زمانے کے
اعتبار سے بھی پرانے نہیں ہیں۔ نثر کے بہترین نمونے جنہیں کوئی ادبی مرتبہ دیا
جاسکے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام کے بعد سے سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب
کی تالیف کا مقصد یہ ہے کہ ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ تک بہترین اور مستند ادیبوں
کی نثر کے نمونے یکجا کر دئے جائیں۔ اسلئے میرامّن سے شروع کرکے ہمیں انشا
پردازوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں انمیں بعض مضامین ایسے حضرات کے ہیں جو
بحمداللہ بقیدِ حیات ہیں۔ اور خداوند تعالیٰ انکی عمروں میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ کتاب اربابِ علم و ادب کے لئے نہیں بلکہ مبتدیوں کی درسی ضروریات پورا
کرنے کیلئے مرتب کیگئی ہے۔ سب سے پہلے اردو زبان کی "تاریخ" پر "اردو کی تخلیق و ارتقاء"

کے عنوان سے ایک مختصر مضمون ہے جسکا ماخذ نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ آنجہانی
کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو موصوف نے اُردو کانفرنس منعقدۂ لکھنؤ ۱۹۱۶ء میں بہ
عنوان داستانِ اُردو پڑھا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی میرا فرض عین ہے کہ حضرت خیالؔ
کا یہ مضمون انشائے لطیف کا ایک معجزہ اور مختلف قسم کے نہایت دلچسپ معلومات کا
ایک سمندر ہے۔ جسے ہر اُس شخص کو جو اُردو سے ذرا بھی مس رکھتا ہے ضرور پڑھنا چاہیئے۔
میرے نزدیک سحر حلال اور سہل ممتنع کی اس سے بہتر مثال اُردو نثر میں میسر نہیں
آسکتی۔ اسکے علاوہ حسن اخلاق اور حسن سلوک کی جو تلقینیں اسمیں موجود ہیں وہ اپنی نوعیت
کے اعتبار سے عدیم المثال ہیں اسکے بعد بیس مختلف انتخابات ہیں جو مختلف مقامات سے
کئے گئے ہیں اور جنکے ماخذ کا حوالہ فہرست میں موجود ہے۔ ہر مضمون سے پہلے اسکے
مصنّف کے مختصر حالات زندگی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی کوشش کیگئی
ہے کہ اسکے اسلوب مخصوص رنگ اور طرز تحریر پر بھی کچھ تنقیدی روشنی ڈالدی
جائے۔ طلبا کی سہولت اور انکے معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے ہر مصنف کی مشہور
تصانیف کے نام بھی اسکے حالات کے تحت میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ ان حالات کا
ماخذ میرے مکرم مسٹر رام بابو سکسینہ کی تصنیف تاریخ ادب اُردو (بزبان انگریزی) ہے
جو بیسویں صدی کا ایک فقید النظیر کارنامہ ہے اور جسکے ذریعہ سے ہماری پیاری زبان پر
نہایت مناسب موقع پر ایک احسانِ عظیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سے بعض مقامات بجنسہ
ترجمہ کر دئے گئے ہیں اور بعض سے صرف خیالات لیکر اپنی زبان میں لکھ دئے گئے ہیں

آگرہ
۲۷۔ اگست سنہ ۱۹۲۸ء } محمود اکبرآبادی

فہرست

باب سوم

اردو کی تخلیق و ارتقاء

دنیا کی قوموں کے مد و جزر ان کے اسباب ترقی و تنزل اور ان سب کے ساتھ ساتھ انکی زبانوں کی پیدائش تدوین و ترقی کا مطالعہ اہل علم کا ایک محبوب مشغلہ ہے حقیقت یہ ہے کہ زبان کے نشو و نما اور ارتقاء کا تمام و کمال تعلق فطرتاً انسان کے اخلاق و معاشرت سے ہونا چاہیئے مگر بعض زبانوں کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبانوں کے بنانے بگاڑنے میں ملکی و سیاسی تاریخ کو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم معاشرتی و اخلاقی تاریخ کے برابر دخل ضرور ہے۔ اسکی ایک بین وجہ یہ ہے کہ قوموں کے اخلاق و معاشرت ہمیشہ انکی ملکی ضروریات کے ماتحت رہا کرتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ زبان کو بھی ملکی و سیاسی ضروریات کا تابع رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اردو انہی زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کی تخلیق و ترقی کی تاریخ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے کسی عنوان علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ اور آیندہ بھی اسی کے دوش بدوش رہے گی۔ زبان کی تاریخ کا مطالعہ اس لئے ہمیشہ نہایت دلکش ہوا کرتا ہے کہ اس میں معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے۔ مگر ہماری زبانِ اردو کی تاریخ معمول سے دلچسپ تر ہے اِس لئے کہ اس کا وجود مختلف قوموں اور ملتوں کے تمدن و معاشرت کے امتزاج کا

ایک نہایت حسین اور حالہ درجہ مفید و سود مند نتیجہ ہے۔ لہذا قبل اسکے کہ ہم براہ راست اردو کی تاریخ پڑھنے لگیں ملک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ سے بہت پہلے، یعنی اس عہد میں جس کی صحیح و مستند تاریخ سوائے قصص و حکایات کے دستیاب نہیں ہوتی، ہمارے ہندوستان میں کئی قومیں مختلف راستوں سے داخل ہوئیں۔ اور مختلف مقامات پر پھیل کر آباد ہوگئیں۔ تاریخی ضروریات کے لئے ان قوموں کا نام غیر آرین رکھدیا گیا ہے۔ یہ مختلف گروہوں اور فرقوں کی شکل میں اس ملک میں داخل ہوئیں۔ اور کبھی متفق نہ ہوئیں۔ اس لئے ہر اعتبار سے آپس میں بیگانہ رہیں۔ اصل یہ ہے کہ زبان و مذہب کے اختلافات نے انکی اجنبیت کو برقرار رکھا اور انہیں کبھی متحد نہ ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان سے زیادہ قوی اور متمدن قومیں غیر ممالک سے آکر، ان پر حملہ آور ہوئیں تو یہ تاب نہ لاکر مغلوب ہوئیں۔ اور آخر کار رفتہ رفتہ فنا ہوگئیں یعنی یہ کہ اپنی وحدت قومی کو کھو بیٹھیں۔ غیر آرین قوموں کا ہر ایک گروہ اپنی زبان بھی باہر سے ساتھ ہی لایا تھا۔ مگر ہندوستان میں وارد ہو چکنے کے بعد، ان زبانوں میں کچھ کچھ تبدیلیاں ہو گئی تھیں غیر آرین قوموں کی انہی قدرے تبدیل شدہ زبانوں کا نام پراکرت ہے۔ چنانچہ ہر مقام اور ہر گروہ کی ایک خاص پراکرت تھی جو کسی نہ کسی شکل میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ غیر آرین قوموں کو مغلوب و منتشر کرنے والی قوم آرین تھی۔ جس کی وجہ تسمیہ اسکے ماخذ یعنی ایران سے لفظاً متعلق ہے۔ مگر ان کا اصلی وطن وسط ایشیا ہے۔

جہاں سے یہ لوگ مختلف ممالک میں پھیلے اور انہی کی ایک شاخ ایران سے ہند میں داخل ہوئی۔ پہلے ان لوگوں نے پنجاب پر قبضہ کیا اور پھر رفتہ رفتہ تمام ملک پر قابض ہو گئے۔ اور بیچارے قدیم باشندوں یعنی غیر آرین لوگوں کو ان کا غلام بنکر ملک میں رہنا پڑا۔

آرین قوم جو زبان اپنے ملک سے بولتی ہوئی آئی تھی اس کا نام ژند تھا۔ مگر ہندوستان میں آکر اسی کا نام سنسکرت ہو گیا۔ اس وقت یہاں خطہ خطہ کی پراکرت جدا تھی۔ آرین اپنی زبان کو نہایت پاک و مقدس سمجھتے تھے اور انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ انکے محکوم یعنی غیر آرین ہرگز بھی اس زبان کو اختیار کریں اور بولیں۔ اس لئے مختلف پراکرتیں آزاد اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور سنسکرت سے متاثر نہ ہوئیں یعنی چونکہ محکوم سنسکرت نہ بول سکتے تھے، اس لئے سنسکرت کے الفاظ انکی پراکرتوں میں داخل ہو کر انہیں مخلوط نہ کر سکے۔ یہ حالت چارسو برس تک قائم رہی یہانتک کہ فارس کے بادشاہ دارا نے ہندوستان پر حملہ کر کے پنجاب اپنے قبضہ میں کر لیا۔ مگر یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز ہے کہ اس وقت کے ایرانیوں اور ہندیوں میں، جو دراصل ایک ہی آرین قوم کی دو شاخیں تھیں، کوئی یکسانیت اور وجہ اشتراک بظاہر نظر نہ آتی تھی۔ بلکہ مذہب اور فلسفہ کے اعتبار سے یکسر بیگانہ معلوم ہوتی تھیں۔ اس شدید اختلاف پر بھی گہری نظروں نے پہچان لیا کہ ژند اور سنسکرت ایک ہی گھر کی بیٹیاں ہیں۔

پالی اس واقعہ کے سوا سو برس بعد تک سنسکرت نہایت خاموشی کے ساتھ ترقی کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ حاکم و محکوم اور انکی زبانوں کا اختلاف بھی دور ہوتا

رہا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ عوام کے طبائع میں ایک غیر معمولی تبدیلی، ایک عظیم الشان انقلاب کی خواہش پیدا ہونی شروع ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گوتم بدھ پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے بالکل ایک نئے فلسفے کی تلقین شروع کردی۔ بدھ کے وطن کی پراکرت ملک کے دوسرے خطوں کی پراکرتوں سے جدا تھی۔ انہوں نے اپنے ہی وطن کی بھاکا میں اپنی ہدایت و وعظ شروع کیا اور یہ زبان پالی کہلائی۔

گوتم بدھ کے ان فقروں سے۔

"دھرم کرو، دھرم کرو، دھرم کا سنکھ پھونکو، دھرم کی وینا بجاؤ"

اردو کی قدامت صاف ظاہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے دراصل گوتم بدھ ہی کے زمانہ میں جنم لے لیا تھا اور اس کے بعد کے واقعات صرف اس زبان کی صفائی، ترتیب اور ترقی کی تاریخ ہے۔

یونانی اثرات

پالی کے عروج کے ڈھائی سو سال بعد یونانیوں نے سکندر کی قیادت (سپہ سالاری) میں ہند پر حملہ کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے یونانی الفاظ یہاں کی زبانوں میں مل جل گئے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد سکندر کے سپہ سالار سلوکس نے حملہ کیا اور چندرگپت سے مقابلہ ہوا۔ آخر صلح ہوئی۔ اور سلوکس کی دختر چندرگپت کے ساتھ بیاہی گئی۔ ان دو حملوں اور ایک ازدواج کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی اثرات ہندوستان میں قوی سے قوی تر ہو کر رہ گئے۔

بدھ نے گو اپنی ہدایتیں پالی زبان کی وساطت سے عام کیں مگر کسی زبان کو اپنی

مذہبی زبان قرار نہیں دیا اس لئے جہاں جہاں یہ مذہب پہنچا وہاں کی پراکرت میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ چونکہ پالی زبان کو کوئی نمایاں خصوصیت یا مذہبی امتیاز حاصل نہ ہوا تھا اس لئے بدھ مذہب کا ہندوستان سے اخراج ہوتے ہی یہ زبان بھی پس پشت پڑ گئی اور آخر کار فنا ہو گئی۔ یونانیوں کے حملے نے بدھ سلطنت کی بنیادیں بہت کمزور کر دی تھیں۔ اس لئے جین مت نے اسے مغلوب کر لیا۔ ہندو دھرم کی از سر نو تجدید ہوئی اور سنسکرت نے دوبارہ جنم لیا۔

مگر اس وقفہ میں جو پالی کے زوال اور سنسکرت کے نشاۃ ثانیہ کے درمیان واقع ہوا ملک کی مختلف پراکرتیں بہت زور پکڑ چکی تھیں اس لئے اب جو سنسکرت میدان میں آئی تو اپنی قدیم بزرگی کو قائم رکھنا کچھ آسان نہ تھا۔ بڑے بڑے قوی رقیبوں کا مقابلہ درپیش تھا۔ چنانچہ بکرماجیت اور راجہ بھوج ایسے صاحبان اقتدار راجاؤں کی حمایت اور سخت کوششوں کے باوجود بھی سنسکرت کو فروغ نہ ہو سکا۔

تاتاری

یونانیوں کے بعد تاتاریوں نے ہندوستان کو اپنی آماجگاہ بنایا اور انکے بعد تورانی اور ترکی حملہ آور ہوئے۔ گو ان قوموں کے حملوں کے اثرات ملک پر سے قطعی زائل ہو گئے مگر ان کی زبانوں نے یہاں کی زبان پر جو اثر چھوڑا وہ زائل نہ ہوا۔ بلکہ مستقل ہو کر رہا۔

پانچ پراکرتیں

سنسکرت کی دوبارہ ترویج کی کوششیں جس وقت ناکام ثابت ہو رہی تھیں اس وقت ملک میں پانچ پراکرتیں نہایت

ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ انکے نام مہاراشٹری، سوُرسینی، ماگدھی، پیساچی اور آپبھرنسا ہیں۔ ان پانچوں میں سوُرسینی برج کے علاقہ کی زبان تھی جس کا نام وہاں کے راجہ سوُرسین کے نام پر پڑا تھا۔ آگے چلکر اسی سوُرسینی نے اپنی ہمعصر زبانوں پر حکومت کی اور سنسکرت کی قائم مقام بن کر رہی۔ اور اسی کا دوسرا مگر زیادہ مشہور اور عامنہ الورود نام برج بھاشا ہے۔ برج کا خطہ ہندوستان کے وسط میں واقع ہے اس لئے جو قومیں یہاں آئیں انہیں سب سے زیادہ اسی قطعہ سے سروکار رہا۔ اس لئے غیر زبانوں کا اثر اور پراکرتوں سے زیادہ یہاں کی پراکرت سوُرسینی پر پڑا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں سب ہمعصر زبانوں سے زیادہ وسعت و صلاحیت اور جلب و قبول کی قوت پیدا ہوتی چلی گئی۔ عربوں کے حملہ کے وقت یہی سوُرسینی یا برج بھاشا یہاں سب سے زیادہ ممتاز تھی۔

عرب اور ایران

عربوں نے ہمیشہ اپنی زبان کو سراہا۔ اور اسکی فصاحت و بلاغت پر اس قدر فخر کیا کہ دوسری قوموں کو اپنے مقابلہ میں گونگا سمجھا چنانچہ اہل ایران کا نام انہوں نے عجم رکھا جس کے لفظی معنی گونگا ہے۔ مگر اسلام کے پیرو ہو کر ان میں اتنی رواداری پیدا ہو گئی کہ وہ دوسری زبانوں کی بھی قدر کرنے لگے۔ اسلامی حملے کے بعد گو ایران کی سلطنت اور وہاں کا مذہب مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئے مگر اہل فارس نے فاتحوں کی زبان اختیار نہ کی اسکے علاوہ عربوں کی جانب سے بھی اس معاملہ میں کوئی جبر نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہارون اور

ماموں اپنی علم دوستی اور فراخ دلی کی بنا پر فارسی کے ساتھ برابر سلوک کرتے رہے آخر الپ ارسلاں کے عہد میں فارسی نے پھر حیات تازہ پائی۔ مگر اسوقت اس زبان کے کچھ اور ہی انداز تھے یعنی یہ کہ عربی سے بہت کافی طور پر متاثر ہو چکی تھی اور وہ یہی نئی فارسی تھی جو ترکوں اور مغلوں کی وساطت سے ہندوستان میں آئی۔

عرب اور ہند ایران کے بعد عربوں نے ہند کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ پہلے پہل انکے مختلف گروہ ہرات و کابل و ملتان میں آئے ایک جماعت دریائے سندھ عبور کر کے راجپوتانہ میں گھستی چلی گئی محمد علافی ایک شخص نے جو عربی نسل سے تھا ہندی بن کر راجہ داہر والئی سندھ سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ یہ واقعات رونما ہو رہے تھے اور اس طرح عربی زبان و تمدن کا اثر آہستہ آہستہ ہندوستان پر پڑ رہا تھا کہ یکایک ۷۱۱ء ۹۳ھ میں سندھ پر محمد قاسم کا حملہ ہوا اس واقعہ نے یہاں کی زبان اور معاشرت پر ایسے گہرے اور قوی اثرات چھوڑے جو زمانہ کے مٹائے نہ مٹ سکے۔

محمد قاسم تین سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس کے ساتھیوں اور اہل لشکر نے سندھ میں شادیاں کیں اور گھر بنا کر رہنے سہنے لگے۔ ان باتوں سے سندھ میں عرب کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ عرب فاتحین کو ایران میں کافی سبق مل چکا تھا اور نو وارد کو ایک غیر ملک میں جو جو دشواریاں پیش آتی ہیں یہ لوگ ان سب کا تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بغیر کسی تعصب کے ہندیوں سے ملنا جلنا اور بغیر کسی نفرت کے ملکی

زبان کو سیکھنا شروع کر دیا تاکہ معاشرت میں آسانی ہو اور غیر ملک میں بود و باش کی دشواریاں رفع ہو جائیں۔

ایک طرف تو فاتح قوم کی فراخ دلی اور عالی حوصلگی کا یہ عالم تھا دوسری طرف یہاں کے باشندوں میں غیر زبان کی مداخلت جائز رکھنے اور اس سے برابر متاثر ہوتے رہنے کی عادت عرصہ دراز سے موجود تھی۔ بلکہ اہل ملک کی طبیعتوں کا ایک جزو بن چکی تھی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور ہندی کی آمیزش شروع ہو گئی نہ صرف یہی بلکہ خلفائے عرب کے دربار تک ہندوستان کے علماء اور پنڈتوں کی رسائی ہونے لگی۔

اس کے علاوہ ایک فطری سہولت اس میل ملاپ کی بہت بڑی مدد معاون بنی۔ سندھ اور برج کی سرحدیں قدرتی طور پر ملی ہوئی ہیں۔ اسلئے ان دونوں خطوں میں زیادہ مراسم و تعلقات قائم تھے۔ چنانچہ برج بھاشا جب سندھ میں پہنچی تو اس نے عربی اثرات بہت جلد قبول کر لئے اور چونکہ اپنی ہم عصر پراکرتوں کے مقابلہ میں یہ زبان زیادہ وسعت پسند تھی اس لئے اس نے سندھی اور دوسری پراکرتوں کو بہت جلد مغلوب کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برج بھاشا کی ترقی اور اردو بننے کی تاریخ عربوں کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اور اسی عہد سے وہ ارتقاء نمایاں طور پر شروع ہوتا ہے۔ جس نے رفتہ رفتہ ایک مرتب و منضبط زبان اردو کے نام سے بنا کر کھڑی کر دی۔

محمود غزنوی سبکتگین کے عہد سے اہل غزنی نے ہندوستان میں سفر شروع کی۔ محمود اس کا فرزند ہندوستان پر پیہم دفعہ پیٹھا اس نے سترہ حملے کئے اور تمام ملک میں ہلچل ڈال دی۔ ان حملوں کے سیاسی اور مذہبی اثرات کچھ ہی ہوں مگر اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ انکی وجہ سے ہندوؤں اور ترکوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔ اور اتحاد زبان و اتحاد خیالات کا ایسا بیج بو یا گیا جو نشو و نما پا کر آخر ایک عظیم الشان درخت بن گیا۔ محمود کے مظالم کا ذکر تو بیانگ دہل کیا جاتا ہے مگر اسکے الطاف و مراحم کے اذکار ہمیشہ نظر انداز کئے جاتے رہتے ہیں۔ اہل ہند کے اوپر محمود اور اسکے پسر مسعود کے بڑے احسانات ہیں۔

ان دونوں کے مراعات و حسن سلوک کے قصے جنہیں بعض خود غرض اہل تاریخ نے کوشش کر کے پوشیدہ رکھا ہے چند در چند اور نہایت دلچسپ ہیں مگر طوالت کے ڈر سے انہیں یہاں دہرایا نہیں جاتا صرف اسی قدر بتانے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ محمود و مسعود کے حسن سیاست و تدبر ملکی نے ہندو مسلمانوں میں ایسا اتحاد باہمی پیدا کر دیا جس نے دو مختلف قوموں کو شیر و شکر کر کے، ان کی زبانوں کو بھی آخر ایک زبان کر دیا۔

شاہانِ غلام شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں بھی ہندو مسلم اتحاد نے ترقی کی اور ہندی و فارسی کا اختلاط بڑھتا اور مضبوط ہوتا رہا مگر شاہانِ غلام کے زمانہ میں فارسی نے اس قدر رواج پایا کہ دکن و بنگال جیسے

دور افتادہ صوبوں میں بھی پھیل گئی۔ اس وقت دلّی، زبان اور زباندانوں کا مرکز اور علوم و فنون کا گھر بنی ہوئی تھی۔ سلطان بلبن کا دورِ حکومت اردو زبان کی تاریخ میں یادگار زمانہ ہے۔ امیر خسروؒ ایسے بزرگ و بلند مرتبہ شاعر کی موجودگی کا شرف اسی عہد کو حاصل ہے۔ انکی حقیقت شناس طبیعت نے وقت اور ضرورت کے اقتضا کو سمجھا اور خالق باری تصنیف کر ڈالی جو ہندو مسلمانوں کے اخلاص و محبت اور فارسی بھاشا کی یگانگت اور یک جہتی کی ایک مستقل اور زندۂ جاوید تاریخ ہے۔

خلجی

جن ضرورتوں نے امیر خسروؒ کو خالق باری کی تصنیف پر مائل کیا وہ روز بروز بڑھتی رہیں۔ اس لئے سلطنت نے بھی اس کام میں دلچسپی لینا اور ہر قسم کی مدد کرنا شروع کر دیا۔ یعنی یہ کہ ہندو مسلم اتحاد بڑھانے کی کوششیں سلطنت کی جانب سے بھی کی جانے لگیں۔ اور رواداری و علم دوستی کا اس حد تک ثبوت دیا گیا کہ ایرانی علما کے پہلو بہ پہلو ہندی فضلا کو بھی جو مذہباً ہندو ہوتے تھے دربار میں جگہ ملنے لگی۔ علاء الدین کے عہد میں یہ خصوصیات نمایاں نظر آنے لگیں

مہارانی کملا دیوی سے سلطان کی مناکحت اور دیول دیوی سے خضر خان کی محبت نے ہندو مسلم اتحاد و اخلاص کو چار چاند لگا دیئے۔ اسکے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے ایک ہندو نژاد خادم کو خسرو کا خطاب دیکر اپنی وزارت کے معزز عہدہ پر فائز کیا اور ملک کا جملہ نظم و نسق اسکے سپرد کر دیا۔ اس سے نہ صرف ہندوؤں کی ہمت و اعتبار میں اضافہ ہوا۔ بلکہ رعایا میں فرض شناسی کا جذبہ بھی پیدا ہوا اور

ہندؤں نے اپنے ملکی کاموں کا بار اپنی گردنوں پر اٹھانا سیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اور ہندی ہر مقام پر پہلو بہ پہلو نظر آنے لگیں۔

تغلق محمد تغلق علوم و فنون کا بڑا دلدادہ تھا اور ادبیات کا اُسے خاص ذوق تھا چونکہ خود بھی فضلائے روزگار میں سے تھا اور تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ادب و شعر سے بھی بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لئے علماء سے بڑی محبت رکھتا اور انکی سرپرستی کرتا تھا۔ محمد تغلق خود بھی ایک بلند مرتبہ ادیب و شاعر تھا۔ اسلئے اتحاد قومی کے ساتھ ساتھ ادب و انشا کا ذوق بھی اسکے زمانہ میں برابر ترقی پذیر رہا اور اسکا دربار ادیبوں اور شعراسے بھر رہا کرتا تھا۔ لیکن جو مراعات عربی و فارسی شاعروں کے ساتھ کئے جاتے تھے وہی ہندی شعرا کے ساتھ بھی جائز رکھے جاتے تھے۔

سلطان فیروز اس معاملہ میں محمد تغلق سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ محمد تغلق کی طرح وہ خود بھی فاضل بے بدل اور علوم و فنون کا حد درجہ شیدائی تھا۔ نگرکوٹ سے سنسکرت و ہندی کی ہزارہا کتابیں یہ بادشاہ اپنے ساتھ دلّی لایا، انہیں پڑھواکر سنا اور پنڈتوں اور علما کو جمع کرکے بہت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اس نے صرف اتنے ہی تک بس نہیں کیا بلکہ علما کو یہاں کی زبان سکھوائی اور پنڈتوں کو فارسی پڑھوائی۔ بادشاہِ وقت کے اتنے شغف اور ایسی خاص توجہ کا اثر ظاہر ہے کہ عوام کے حق میں کس قدر مفید اور سودمند ہوا ہوگا۔ فارسی اور ہندی میں آخرکار اس قدر موانست اور اخلاص پیدا ہوگیا کہ علماء کا لہجہ بدلنے لگا۔ اور انکی زبان میں اب فرق پیدا ہوتا محسوس ہونے لگا جسکا

نتیجہ چند روز بعد اردو کی شکل میں ظاہر ہو کر رہا۔

لودی

اس اختلاط میں سو برس گزرنیکے بعد سلطنت لودیوں کے ہاتھ آئی۔ لودیوں کا عہد دوسرے عہدوں پر اس لئے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ بیچ بچتہ اردو پر پاتھی۔ بہلول کے بعد سکندر تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ بادشاہ واقعی نہایت صاحبِ اقبال انسان تھا اسکے عہد مبارک میں قومی مغائرت کی سمیت یک قلم دور ہوگئی۔ اور دلوں میں اتحاد و خلاص کے مستقل جذبات جاگزیں ہوگئے۔ اس معاملہ میں یہ عہد یادگار زمانہ ہے۔ شاہانِ تغلق کی طرح سکندر بھی ادب و انشا کا شیدا اور شاعری کا عاشق زار تھا خود بھی شاعر تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔ اسی کے عہد میں ایک نہایت مشہور طبی تصنیف ارگرجھا بیدک ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرائی گئی اور طب سکندری اسکا نام رکھا گیا۔ علم کا اسکو اس حد تک شوق تھا کہ اپنی فوج میں تعلیم عام کرکے اس نے ملک بھر کے جاہلوں کو خواندہ بنا دیا اور سارے ملک میں تہذیب و شائستگی پھیلا دی۔ نہ صرف یہی بلکہ سکندر نے حاکم و محکوم کا امتیاز بھی اٹھا دیا اور صرف جوہرِ علمی کی بنا پر انتظام ملکی کیلئے حکام کا انتخاب ہونے لگا۔ اس موقع کو غنیمت جانکر ساری خلقت تحصیل علم کیلئے ٹوٹ پڑی، ملک میں فارسی کا مذاق عام ہو گیا۔ ہندو رعایا کے افراد فارسی پڑھ پڑھ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے لگے۔ اور فارسی کی جانب کچھ اتنے مائل ہوئے کہ مسلمانوں پر سبقت لے گئے۔

بادشاہوں کی اس بے نظیر رواداری، یہاں کے رسم و رواج اختیار کرنے اور ملک کی ہر چیز کو سراہنے اور اس سے محبت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا نہ صرف تباہی اور پامالی سے بچی بلکہ اس میں بھی برابر ترقی جاری رہی۔ اور بھاشا کے شاعروں کی فارسی شعرا کے برابر عزت و توقیر، قدر و منزلت ہوتی رہی۔ ایک جانب تو بادشاہوں کی رواداری کے سایۂ عاطفت میں بھاشا پھولتی پھلتی رہی، دوسری جانب علما کی بے تعصبی کی پناہ میں فارسی کا اقتدار بڑھتا رہا۔ مگر چند ہی روز میں بھاشا نے فارسی سے اتنا کچھ حاصل کر لیا اور اپنے دائرے کو اس قدر وسیع بنا لیا کہ بالکل ایک نئی زبان کی صورت نظر آنے لگی۔ اور اسی نئی زبان کا نام اردو ہے۔

مغل اور اردو

تیمور کے حملے نے ہندوستان کی ہر شے میں انقلاب و انتشار پیدا کر دیا تھا اور زبان پر بھی اس کا بہت کافی اثر تھا مگر سکندر لودی نے پھر ترقی کے اسباب پیدا کر دیئے۔ اور فارسی و بھاشا کے اتحاد کا سامان بہم فراہم کر دیا۔ مگر اسکی زندگی نے وفا نہ کی۔ ابراہیم اپنے باپ کی سی اہلیت کا انسان نہ تھا۔ آخر کار پانی پت کے میدان میں اس نے بابر سے شکست کھائی۔ اور سلطنت ہندوستان لودیوں کے قبضہ سے نکل کر مغلوں کے ہاتھ آگئی۔

بابر

بابر صرف سپاہی ہی نہ تھا، بلکہ ادبی اعتبار سے بڑی بلند پایہ شخصیت کا مالک تھا۔ ہندوستان میں آکر اس نے اپنی رعایا کی زبان سیکھی اور اپنے روزمرہ میں داخل کی۔ تزک بابری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر نے ترکی کے

پہلو بہ پہلو ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اس نے اپنے اشعار میں بسا اوقات ہندی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر کو یہاں کی محض زبان ہی سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ہندی جذبات و خیالات بھی اُسے بیحد متاثر کر رہے تھے۔ بابر کے زمانہ میں زبان نے جو صورت اختیار کی تھی اور جس کے بہترین نمونے خود بابر کے کلام میں ملتے ہیں، وہ اردو کے ارتقا کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، مگر طوالت کے ڈر سے مثالیں پیش نہیں کی جاتیں۔

اکبر

اکبر کے مبارک عہد میں۔ اس ذیل میں نمایاں ترقی ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کی طرح اس شاہنشاہ نے بھی اپنے یہاں حکما اور فضلا جمع کئے اور علمی چرچے نہایت شد و مد سے ہونے لگے۔ اکبر ہندوستان سے محبت کرتا تھا اور یہاں کے ہندوؤں کا دل سے خواہشمند تھا، اس کو بڑی آرزو تھی کہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر رہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ یہاں کے رسم و رواج میں اس نے یہاں تک دلچسپی لی کہ ہندی تہوار شاہی محل میں منائے جانے لگے۔ جب بادشاہ کی رواداری کا یہ عالم دیکھا تو رعیت کہاں تک متاثر نہ ہوتی مسلمانوں کے تہواروں نے ہندوؤں کے یہاں شرف قبول حاصل کیا۔ دو مختلف قوموں کے ایسے میل جول اور انکی معاشرت کے ایسے اشتراک سے زبان پر جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے ظاہر ہے۔ ہندوؤں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں لفظ مسلمانوں نے سیکھے

اور اسی طرح مسلمانوں کے ہزار ہا الفاظ ہندوؤں کی زبان زد ہو گئے اس کے علاوہ وقت اور ضرورت کے اعتبار سے ہزار ہا نئے الفاظ وضع ہوتے اور زبان کا جزو بنتے رہتے۔ اس طرح بھاشا میں نہایت مستقل اصلاح ترقی اور وسعت پیدا ہوتی رہی۔

راجہ ٹوڈرمل کی وزارت کے یہ اثرات رونما ہوئے کہ نیچ قوم تک دوات کی پوجا کرنے لگی۔ تمام ملک میں فارسی کا چرچا ہونے لگا اور تعلیم عام ہو گئی۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ ہندو مسلمان ایک مکتب میں ساتھ پڑھنے لگے اور قومی اختلافات برابر مٹتے رہے۔ شاہزادہ سلیم کی راجپوتوں میں شادی ہو جانے نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ شادی کی رسموں میں جو گیت وغیرہ گائے گئے ان سے فارسی ہندی اتحاد کا پتہ لگتا ہے۔

جہانگیر

اکبر کے زمانہ میں جن تعلقات کی بنیاد پڑی تھی وہ جہانگیر کے زمانہ میں مضبوط ہوتے رہے فارسی و ہندی کے اختلاط سے جو زبان بن رہی تھی وہ ہی سلیم کی مادری زبان تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تمام امرا اور اہل دربار بھی اسی کو سراہتے ہونگے جب حکومت اور ارباب حل وعقد کی یہ حالت ہو گی تو رعایا کیا کچھ نہ کرتی ہو گی۔ شاہزادہ خرم کی پیدائش پر محل میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ سب ہندوانہ تھیں۔ جہانگیر کا علمی مذاق اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود صاحب قلم تھا اور اپنی تزک کا مصنف ہے۔ اسے زبان سے محبت تھی۔

اور اسکی اصلاح کا بیحد شوق تھا۔

شاہجہان شاہجہاں کو اردو پر بڑے حقوق حاصل تھے۔ اردو اسکی مادری زبان تھی۔ وہ اردو کی گود میں پیدا ہوا اور اسی کے دامن میں پلا اور تربیت پائی معمولی مثال یہ ہے کہ باپ کو شاہ بھائی اور دادا کو شاہ بابا کہتا تھا۔ شاہجہاں جب بادشاہ ہو کر دلی آیا تو اردوے معلی ابھی اسی کی سرپرستی میں پرورش پانے لگی۔ شاہجہاں کو اس نئی زبان سے اس قدر محبت تھی اور وہ اس پودے کی آبیاری اس قدر ضروری سمجھتا تھا کہ قیدکے زمانہ میں بھی اسی سے جی بہلایا کرتا تھا۔

عالمگیر اورنگ زیب کا عہد خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے بھاشا نے اسی عہد میں اپنی کینچلی بدلی اور اردوے معلی کی صورت اختیار کی۔ عالمگیر میں علم و زبان کا شوق فطری اور موروثی تھا۔ اس نے ہندو شعرا کی بڑی سرپرستی کی۔ جس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ وہ علوم و فنون کا بڑا سرپرست اور ادب و انشا کا مربی تھا۔ اس نے فیروز تغلق کی طرح تعلیم اپنی مملکت میں عام کی اور طلبا کو وظائف دیکر انکی ہمت افزائی کی۔ ان وجوہ سے علم کا چرچا گھر گھر پھیلا اور زبان کا مذاق عام ہوا۔ عالمگیر کے عہد میں جو زبان رائج تھی وہ اچھی خاصی اردو تھی بھاشا کی قدیم تصنیفات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی عربی الفاظ ان میں داخل ہیں۔ مگر یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ اس لئے کہ حاکم زبان کا اثر محکوم

زبان پر ضرور پڑتا ہے مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بھاشا کے الفاظ نے فارسی نظموں میں راہ پائی اور اشعار میں داخل ہو گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حاکم و محکوم کا میل جول کس درجہ پر تھا۔ اور دونوں قومیں ایک دوسرے کی معاشرت کو کس قدر پسند کرتی اور سراہتی تھیں۔ عہد عالمگیر کے جو دوہے وغیرہ ملتے ہیں اُن سے خاص طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے۔

دکن

اردو کی تاریخ میں دکن کا ذکر ایک نہایت ضروری جزو ہے۔ فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے جو زبان بن رہی تھی وہ بابر، اکبر اور شاہجہاں کی محبوب زبان تھی۔ مگر جب وہی زبان منجھ کر اردو بننے کو ہوئی تو اہل دہلی نے اسکی طرف کوئی خاص اعتنا نہ کی اور اصل اردو میں سب سے پہلے دکن میں تصانیف شروع ہوئیں۔

مہاراشٹری جو دکن میں رائج تھی بگڑ کر مرہٹی بنی اور پھر دکنی اس کا نام پڑا۔ ہمایوں کی فتح گجرات کے بعد اور سلطان بہادر شاہ کے زوال پر شمال اور دکن میں تعلقات شروع ہوئے۔ اور دونوں مقامات کی زبانیں آپس میں ملنی شروع ہوئیں مگر دکن کو اس معاملہ میں امتیاز خاص حاصل ہے۔ شمال میں فارسی حاکم و محکوم دونوں کی ایک عرصہ سے زبان بنی ہوئی تھی۔ اس لئے اظہار مطالب بھی اسی زبان میں ہوتا تھا۔ مگر دکن میں عوام تو ایک طرف سرکاری دفتروں میں بھی ملکی زبان یعنی دکنی رائج تھی۔ اس لئے جذبات و خیالات کا اظہار بھی اس زبان یعنی

دکنی اردو میں ہونے لگا اور تصنیفات بھی اسی زبان میں ہونے لگیں۔

یوسف عادل شاہ نے جب سلطنت بیجاپور قائم کی تو اپنی نذر کے مطابق خطبہ میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے مقدس ناموں کو شامل کیا۔ اس وقت سے سلطنت بیجاپور اور پھر نظام شاہیوں اور قطب شاہیوں میں مجالس عزا کا دستور ہو گیا۔ ان مجالس میں عموماً ایرانی ملک ہمایان کے شاعروں اور فارسی شعرا کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ مگر اب وہ زبانیں متروک ہو چکی تھیں۔ دکن اپنی زبان کی شاعری کا جویا تھا۔ اس لئے بہت سے دکنی مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جن میں اولیت کا فخر شجاع الدین نوری کو حاصل ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے وقت میں یہ ذکر بہت عام ہو گیا۔ ہاشم علی برہان پوری نے تو اپنے کو اس کے لئے وقف ہی کر دیا۔ انکے مراثی کا ایک اچھا ذخیرہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بحمداللہ اب تک موجود ہے۔ پرانی تحقیقات کے مطابق ولی کو اردو کا باوا آدم کہا جاتا ہے مگر یہ قطعی غلط ہے اس لئے یہ کہنا کہ اردو کی بنیاد غزل پر رکھی گئی اس سے زیادہ غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو کی ابتدا مراثی سے ہے اور اس لئے یہ زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے کہ اسکی بنیاد اخلاق اور اس پاک ذکر پر ہے جو دنیا میں سب سے مقبول اور محترم خیال کیا جاتا ہے۔ نوری اور ہاشم کے بعد دکن میں اور بہت سے شاعر پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ وہاں ادب کا چرچا گھر گھر ہو گیا۔ خود وہاں کے بادشاہوں نے دکنی میں شعر کہے۔ سلطان قطب شاہ نے جو شاہجہاں کا ہمعصر تھا، اس میں غزلیں کہیں اور

ابوالحسن تاناشاہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اسی زبان میں کیا۔ مگر عالمگیر کے حملوں نے دکن کی سلطنتوں کو برباد کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ شعرا بھی منتشر ہو گئے۔

بہادر شاہ اول

گو اردو اہل دہلی کے روزمرہ میں داخل تھی مگر درحقیقت وہاں اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ عالمگیر کے عہد تک بھی یے تعلقی قایم رہی آخر بہادر شاہ کے دربار میں دکنی شاعروں کو جگہ ملی تو انکے ساتھ ساتھ اردو کو بھی باریابی میسر ہوئی۔ ان لوگوں کو زبان کے معاملہ میں اہلِ دہلی پر فوقیت تھی۔ دلی والے یہ دیکھ کر بہت شرمائے اور پھر اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور میر جعفر زٹلی جو خود بھی دکن کی ہوا ئیں کھا چکے تھے اردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہوئے مگر انتاب جو کچھ ہوا وہ صرف سطحی تھا، آخرکار محمد شاہ کے عہد میں اردو کی طرف خاص توجہ کی گئی۔

عمدۃ الملک کی انجمن

بہادر شاہ کے وقت تک اردو کی بنیادیں مضبوط نہ ہوئی تھیں اور کوئی ایسا کام شروع نہ ہوا تھا جس سے زبان میں مستقل اصلاح ہوتی رہے اور وسعت پیدا ہو۔ جب بیدل نے ادھر توجہ کی تو جو امرا انکی شاگردی کا دم بھرتے تھے وہ بھی اردو میں دلچسپی لینے لگے۔ اور اس زبان کو بڑی بڑی مجلسوں اور محفلوں میں جگہ ملنے لگی۔ ان ہی امرا میں عہد فرخ سیر میں ایک امیر تھا جس کا نام امیر محمد خاں تھا۔ علاوہ عربی فارسی یہ شخص سنسکرت اور بھاشا کا بھی بڑا زبردست عالم تھا انکے دو بڑے عہدہ دار

تک دہلی میں زبان زد خلائق رہے۔ مرزا بیدل کی معیت میں جب امیر محمد خاں کو جو انجام تخلص کرتے تھے اردو کا شوق پیدا ہوا تو سینکڑوں کو شاعر بنا کر چھوڑ دیا۔ زبان کی ترقی کے لئے انجام نے اپنی نگرانی میں ایک انجمن قائم کی جس میں اس عہد کے فضلا اور زباندان شریک ہوکر الفاظ و محاورات پر بحث کرتے تھے اور بڑی کاوش و عرق ریزی کے بعد تحقیق شدہ الفاظ انجمن کے دفتر میں درج کئے جاتے تھے اور سارے ہندوستان میں بطور سند اسکی نقلیں بھیجدی جاتی تھیں۔ اس انجمن کے ممبران میں حاتم اور ضاحک بھی تھے۔ اس کا اس قدر شہرہ ہوا کہ اہل ذوق و تلاش دور دور سے اسکے اشتیاق میں آنے لگے۔ آخر ولی بھی حقیقت کی تلاش میں دکن سے دلی آئے۔ اور اس انجمن سے استصواب کیا۔ اس انجمن کا اعتبار روز بروز بڑھتا رہا آخر کو محمد شاہ نے محمد امیر خاں کو عمدۃ الملک کا خطاب مرحمت کرکے اپنا وزیر مقرر کیا اور نائب بنایا۔

شاہ عالم

دلی کے اجڑنے پر اردو بھی مٹ جاتی مگر یہ بڑی سخت جان نکلی۔ شاہ عالم نے اس زبان کی بڑی ہمت افزائی کی۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ شعرا کی انکے یہاں بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ شاہ عالم کی حمایت میں اردو ترقی کرتی رہی اور برابر شعرا پیدا ہوتے رہے۔ دلی میں بہادر شاہ ظفر اور لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کے عہد تک دربار میں اردو کی عزت و توقیر کا یہی حال رہا۔

قبل مسیح سے لیکر اس وقت تک کی تاریخ اور وہ جملہ مدارج جنہیں طے کرکے اُردو زبان نے موجودہ صورت اختیار کی ہے ہمارے سامنے سے مجملاً گذر چکے ہیں ہم نے دیکھا کہ مختلف سلطنتوں کے عہدِ حکومت میں اردو نے درجہ بدرجہ ترقیاں کیں اسی طور پر اس زبان کی ترقی اور خصوصاً اسکی نثر کی ترقی میں سلطنتِ برطانیہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ انگریزوں نے اپنے عہدِ حکومت کی ابتدا ہی میں یہ محسوس کر لیا کہ اس ملک میں دو زبانیں رائج ہیں۔ ایک تو وہ جو سرکاری اور دفتری زبان ہے اور دوسری وہ جسے عوام الناس بولتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ اس دو عملی کا قیام محالات سے ہے جب سنسکرت اور پالی زبانیں فروغ نہ پا سکیں تو فارسی کس شمار میں ہے۔ اس لئے انہوں نے عوام کی زبان کو جو یہاں کی زمین کی اصلی پیداوار تھی بڑھانا اور وسیع کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ چنانچہ اس باب میں حضرت خیال اس طور پر تحریر فرماتے ہیں۔

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء	دو قلعہ معلیٰ کے بعد فورٹ ولیم اردو کا گھر اور عمارۃ الملکی اسکول کا نمونہ بنا۔

برٹش گورنمنٹ مغلوں کی جائز نائب تھی جس طرح اگلی سلطنت نے اپنی رعایا کا خیال کرکے آخر انہیں انکی زبان عطا کی۔ اس گورنمنٹ نے بھی اسی طرح رعایا پروری کی مثال قایم کی۔ سرکاری حکم و خرچ سے فورٹ ولیم کلکتہ میں اردو کالج قایم ہوا اور ڈاکٹر جون گلکرسٹ کی نگرانی میں اس کا نام و کام چل نکلا۔ بکرماجیت و مہابلی جی

اکبر کے سنگاسن میں نو رتن جڑے تھے مگر اس نئے تخت میں گیارہ رتن لگے اور چمکائے۔ سید محمد بخش مہجوری، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، بابو نہال چند لاہوری، میر امن، حفیظ الدین، شیر علی افسوس، کاظم حسین جوان، مظہر علی ولا، اکرام علی اور للو لال کوی سے یہ منتخب جواہر اکٹھا کئے گئے۔ اور سلطنت کے اقبال اور ان گیارہ یاروں کی بدولت اردو بھی پھلنے اور سنورنے لگی۔"

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔

بہرحال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعت زبانِ اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ امرا اہل دول سے انعام لیکر گزارہ کریں۔ یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں۔ نثر کے حال پر کسی کو مطلق توجہ نہ تھی کیونکہ کاروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے عرصہ میں کتنی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اسکی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس نئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا۔ میر عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نو طرز مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی ۱۱۹۰ھ / ۱۲۱۳ھ میں نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چہل پہل کہ شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے درباروں میں پہنچ پہنچنے

کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا اس نے دیکھا۔ نظرباز تاڑ گیا۔ کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اسکی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں شیر علی افسوس نے باغ اردو اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں آرائش محفل لکھی۔ میرامّن دہلوی نے ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی۔ ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں شری للوجی کوی نے پریم ساگر لکھی اور بیتال پچیسی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی تھی ہیں ظرافت کے پھول کھلائے"

عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اسکے سر پر رکھا یعنی ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ بعد اسکے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے"

سرکاری زبان

صرف اسی کالج پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ اردو کو سلطنت کی زبان بنانے کی کوشش کی گئی۔ آخر ۱۸۳۵ء میں سرکاری

دفتری زبان اُردو قرار پائی۔ آزاد لکھتے ہیں۔

سنہ ۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔"

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان بھی ہے، دفتری زبان بھی یہی ٹھیری۔ اردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان میں علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۴۲ء دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہنچانے لگی۔"

اس سوسائٹی کے متعلق حضرت تنہا لکھتے ہیں۔

دلی کی اُردو سوسائٹی

"سرکاری توجہ و مہربانی سے ادھر بنگالہ و کلکتہ میں اس زبان کا زور قائم ہو لیا تو اب اسی خیال نے اس زبان کے اصلی گھر کو یاد کیا اور سنہ ۱۸۴۳ء میں ڈاکٹر اسپرنگر کی زیر نگرانی دلی میں ایک اردو سوسائٹی بنائی گئی۔ اور غدر تک یہ محکمہ قائم اور اُردو کو بڑھاتا اور ملک کو فائدہ پہنچاتا رہا۔ منشی کریم الدین پانی پتی کے ساتھ پنڈت رام کشن، پنڈت اجودھیا پرشاد، موتی لال، دھرم نرائن، شیو نرائن، دتا رام برہمن، اور مہر دیو سنگھ، رام چندر نے

اپنی زبان کی خدمت کی اور ترجموں اور تالیفات و تصنیفات سے اردو کا خزانہ بھرتے رہے۔ اس وقت ممالک متحدہ میں بھی غیرت باقی تھی۔ اور مسٹر ریڈ کی توجہ سے قمرالدین چرونجی لال، بنسی دھر، سری لال اور موہن لال نے اپنی اردو کو فروغ دینے میں جانیں لڑائیں۔"

سائنٹفک سوسائٹی

انگریزوں کا اردو کی حمایت سے صاف طور پر مطلب تھا کہ بجائے اسکے کہ تمام ملک کو اپنی زبان سکھائیں خود ملک کی زبان سیکھ کر یہاں کے معاملات کو بخوبی سمجھ لیں اور حاکم و محکوم میں رابطۂ اتحاد قائم کریں۔" سرسید جو ایسے اتحاد کے دل سے حامی اور ہندوستان کے لئے اُسے ایک نعمت سمجھتے تھے اس مقصد کے انجام کی خاطر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور راجہ جے کشن داس کی اعانت سے غازی پور و علی گڑھ میں انہوں نے ایک سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ یہ اکیڈمی ۱۸۶۲ء میں قائم ہوئی اور مسٹر ڈیمس کمشنر میرٹھ اور مسٹر بریلی کلکٹر ضلع کی ہمدردی اور امداد کی بدولت تین چار برس کے اندر اندر اتنی ترقی کر گئی کہ اس وقت کے کل زبان داں اور علم دوست انگریز اسکے شریک ہوئے اور آخر ڈیوک آف آرگائل (وزیر ہند) بھی اسکی طرف مخاطب ہو کر سوسائٹی کے پیٹرن بنے۔ لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ پنجاب نے اسکی حمایت و امداد کی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے توجہ و سرگرمی دکھائی۔ تصنیف و تالیف کا راستہ کھلا، اردو میں انگریزی سائنس اور علوم و فنون کے ترجمے شروع ہو گئے۔ منشی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال

اور پنڈت دھرم نرائن کے سے بزرگوں کے انہماک نے ملکی زبان کو مغربی علوم کے چشموں سے بھی سیراب کرنا اور اس پودے کو بڑھانا شروع کر دیا۔"

یہ ہے اردو زبان کے بننے اور ترقی کرنے کی تاریخ جو آپکے سامنے پیش کی گئی۔ اسکے ادب بننے کی تاریخ، اہل علم کی ضرورت کیلئے اس تاریخ سے اہم تر ہے۔ نظم کا سرمایہ اردو میں بحمد اللہ بہت کافی موجود ہے مگر نثر کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی، اسلئے نثر کا ذخیرہ اتنا نہیں جتنا ایک ادبی زبان کا ہونا چاہئے۔ اس فیلڈ میں میر امن دہلوی اور مرزا رجب علی بیگ سرور سے ابتدا ہے۔ یہی حضرات ادب نثر کا سنگ بنیاد رکھنے والے ہیں۔ انکے بعد غالب ہیں جنہوں نے قدیم طرز تحریر بالکل بدل کر رکھ دیا۔ انکے بعد سرسید، آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور محسن الملک کی ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے اپنے مقام پر وہ وہ کارہائے نمایاں کئے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ان بزرگوں کے کارنامے بطور احسان کے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ انکے بعد اور بھی بہت سے عدیم المثال ادیب و انشاء پرداز پیدا ہوئے جو غیر فانی تصنیفیں چھوڑ گئے ہیں۔ موجودہ زمانہ بھی خالی نہیں اور مختلف ذرائع سے اردو میں اضافہ کرنیکی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مگر رسائل میں، کثرت انکی ہے جن کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

(۱) سیر پہلے درویش کی

میر امّن دہلوی

میر امّن دہلوی متخلص بہ لطف دہلی کے باشندے تھے۔ انکے آبا و اجداد عہدِ ہمایوں سے دربارِ مغلیہ میں نہایت معزز رہے اور ہمیشہ جاگیر و وظائف سے مستفیض ہوتے رہے۔ سلطنتِ مغلیہ کی بربادی پر احمد شاہ درّانی کے سپاہیوں نے میر امّن کے آبائی مکان کو لوٹ لیا اور سورج مل جاٹ نے انکی قدیم جاگیروں کو ضبط کر لیا۔ اس بے اطمینانی و بے سروسامانی کی حالت میں بیچارے دہلی کو خیرباد کہکر پٹنہ چلے آئے۔ جہاں چند سال قیام کیا۔ پٹنہ سے کلکتہ چلے گئے اور یہاں کچھ عرصہ تک نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی کے پڑھانے پر مامور رہے۔ اسکے بعد میر بہادر علی نے انکا تعارف ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے کرایا۔ جن کے اشارے سے میر امّن نے قصّۂ چہار درویش کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اُردو ترجمہ کا تاریخی نام باغ و بہار ہے اور اسی نام سے یہ کتاب زیادہ مشہور ہوئی۔ چہار درویش ایک نہایت دلچسپ قصہ ہے جسے امیر خسروؒ نے اپنے اُستاد حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے ایامِ علالت میں اُن کا دل بہلانے کیلئے تصنیف کیا تھا چند روز کے بعد آخرالذکر کو صحت ہوئی۔ اور انہوں نے دعا دی کہ جو کوئی بیماری میں اس قصہ کو سُنے گا شفا پائیگا۔ یہ قصہ فارسی میں ہمیشہ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور تحسین و

امن کے ترجموں کے ذریعہ سے اسے اس قدر شرف قبول حاصل ہوا کہ ملک کی تمام خاص خاص اور چند غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر رہا۔ میر امن کا ترجمہ سنہ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ اس کا ماخذ تحسین کا ترجمہ ہے جو فارسی و عربی الفاظ و محاورات کی کثرت کے باعث ہمیشہ قابل اعتراض سمجھا گیا۔ چہار درویش کی فارسی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور میر امن اپنے اسلوب نگارش کی سادگی کے باعث اردو میں بھی وہی سلاست و صراحت اور محاورہ کی صفائی قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو اصل میں موجود ہے۔ میر امن کے اسلوب و زبان کو بیحد سراہا گیا ہے اور بعض کے نزدیک انکی نثر کا وہی درجہ ہے جو میر کی نظم کا ہے۔ سرسید نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں میر امن کی تقلید کی ہے۔ چہار درویش نہ صرف قصہ کے اعتبار سے نہایت دلکش ہے بلکہ اس میں اہل مشرق کے عادات و خصائل، رسم و رواج کی صحیح تصویریں دستیاب ہوتی ہیں۔ اسکے دیباچہ میں اردو زبان کی تخلیق کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو حد درجہ مختصر، نامکمل اور بعض مقامات پر غلط ہے۔ باغ و بہار اہل مغرب میں بہت مقبول ہوئی اور زبان دانی کے امتحانات کے لئے ابتک نصاب میں داخل ہے۔ علاوہ باغ و بہار کے میر امن گنجینۂ خوبی کے بھی مصنف ہیں جو ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کے نمونہ پر سنہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف کی گئی۔ کریم الدین کا خیال ہے کہ میر امن نے اپنی غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا ہوگا جو غالباً اب ضائع ہو گیا۔ میر امن شعر میں کسی کے شاگرد نہ تھے، کیونکہ ڈاکٹر فیلن نے خود انکی زبان سے سنکر اسکا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔ ذیل کا مضمون باغ و بہار سے ماخوذ ہے۔

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے، الا اس عاجز کا

ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا تاجر تھا اس وقت کوئی مہاجن یا بیوپاری انکے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے مقرر تھے۔ خرید و فروخت کے لئے اور لاکھوں روپیہ نقد اور جنس ملکوں ملکوں کی گھر میں تھی۔ انکے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے ایک تو یہی فقیر جو کفنی اور سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر ہے اور بولتا ہے اور دوسری ایک بہن جسکی قبلہ گاہی نے اپنی زندگی میں ایک سوداگر بچہ سے شادی کر دی تھی وہ اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اسکے لاڈ اور پیار کا کیا کہنا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوچلے سے ماں باپ کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا اور سپہ گری کا کسب و فن سوداگری کا کھاتہ و روزنامچہ سیکھنے لگا چودہ برس بےفکری سے گذرے کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یکبارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی بڑا بوڑھا سر پر نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات و دن رویا کرتا تھا کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ جوں توں کر کے چہلم کیا اپنے بیگانے جمع ہوئے جب فاتحہ سے فراغت پائی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے بس صبر کرو اور اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار ہو۔ تسلّی دیکر وہ تو رخصت ہوئے گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آکر حاضر ہوئے نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظروں سے دیکھ لیجئے۔ میری نگاہیں یکبارگی

اس دولت پر پڑیں آنکھیں کھل گئیں دیوانخانہ کی تیاریوں کا حکم دیا۔ فراشوں نے فرش وغیرہ بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگذار نوکر رکھے۔ انکی زرق برق پوشاکیں بنوائیں۔ قیقرمت پر تکیہ لگا کر بیٹھا ویسے ہی آدمی لنڈے پھانکڑے مفت پرایا مال کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آن کر مصاحب بنے ان سے آٹھ پہر صحبت رہنے لگی اور طرح طرح کی واہی تباہی باتیں کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کنتکی شراب یا گل گلاب کچھ لیجئے نازنین معشوقوں کو بلوا کر انکے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔ غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے ہر دم کے کہنے سُننے سے اپنا مزاج بھی بہک گیا۔ شراب ناچ رنگ اور جوئے کا چرچا ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ حالت دیکھی جو جس کے ہاتھ لگا الگ کیا گویا لوٹ مچا دی۔ مجھے خبر نہ تھی کہ کتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اور کہاں سے آتا اور کدھر جاتا ہے مال مفت دل بیرحم اس فضول خرچی کے آگے اگر گنج قارون بھی ہوتا تو وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصہ میں ایکبارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں نثار کرتے تھے کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار پیادے ڈہلیت خاص بردار ثابت خانے سب چھوڑ کر کنارے لگے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دھڑی کی ٹھٹھیاں نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے

کے گذر گئے تب بھوک کی تاب نہ لا سکا۔ ناچار بیحیائی کا برقع منہ پر ڈالکر یہ قصد کیا کہ
بہن کے یہاں چلئے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ والد کی وفات کے بعد نہ بہن
سے سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو تین خط ماتم پرسی اور اشتیاق کے لکھے
ان کا جواب بھی اس خواب خرگوش میں نہ دیا۔ اس شرمندگی سے دل تو نہ چاہتا تھا
مگر سوائے اسکے اور کوئی ٹھکانا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ جوں توں خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار
محنت سے کئی منزل کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اسکے مکان پر پہنچا وہ ماں جائی
میرا یہ حال دیکھکر بلائیں لینے لگی اور گلے ملکر بہت روئی۔ تیل ماکلے ماش مجھ پر سے
صدقہ کئے اور کہنے لگی اگرچہ ملاقات سے دل خوش ہوا لیکن بھیا یہ تیری کیا صورت
بنی۔ اس کا جواب کچھ نہ دے سکا۔ بلکہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے
جلدی سے ایک پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے پہنے ایک
مکان پر تکلف اپنے پاس میرے رہنے کے لئے مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات
حلوہ سوہن پستہ مغزی ناشتہ کو۔ تیسرے پہر کو میوے خشک و تر پھل پھلاری
کھلاتی اور رات و دن دونوں وقت پلاؤ نان قلئے کباب تحفہ و مزیدار منگوا کر اپنے
روبرو کھلاتی۔ اس طرح خاطرداری کرتی میں اس طرح کا آرام پا کر خدا کی درگاہ میں
سجدہ شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اسی فراغت سے گذرے کہ پاؤں اس خلوت سے
باہر نہ رکھا۔ ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر کرتی تھی کہنے لگی
اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے

آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں خوش ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا
لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں۔
جو مرد نکھٹو ہو کر گھر میں بیٹھا رہتا ہے لوگ اُس کو طعنہ دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے
آدمی چھوٹے بڑے تمہارے بے سبب بیٹھے رہنے پر کہیں گے کہ ماں باپ کا
مال کھو کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ نہایت بے عزتی اور میری تمہاری ہنسائی اور
ماں باپ کے نام کو داغ لگنے کا سبب ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں
بنا کر تمہیں پہناتی اور کلیجہ میں بٹھاتی۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کرو خدا چاہے دن
پھریں اور حیرانی پریشانی و مفلسی کے بدلے دلجمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سنکر مجھے بھی
غیرت آئی۔ اسکی نصیحت پسند کرکے جواب دیا۔ اچھا تم اب ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں میری
مرضی پا کر گھر میں سے پچاس توڑے اشرفیوں کے بھیل و لونڈیوں کے ہاتھ لوا کر میرے
آگے رکھے اور بولی سوداگروں کا ایک قافلہ دمشق کو جاتا ہے تم ان روپیوں سے
جنس تجارت کی خرید کر کے ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے دستاویز لکھوالو اور آپ
بھی دمشق کا قصد کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال مع منافع سمجھ
بوجھ لو۔ میں وہ نقد لیکر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کے ایک سوداگر کے سپرد کیا۔
اور نوشت و خواند سے فراغت پا کر وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔
اور فقیر نے خشکی کی راہ اختیار کی۔ جب رخصت ہونے لگا تو بہن نے ایک بھاری جوڑا
اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے مرصع تواضع کیا اور ایک خاصدان میں مٹھائی بھر کر ہرنے

سے ہٹادی اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوادی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ دہی کا ٹیکہ ماتھے پر لگایا۔ آنسو پی کر بولی سدھارو تم کو خدا کو سونپا پیٹھ دکھا کر جاتے ہو۔ اسی طرح منہ دکھاتے جلد آنا۔ میں نے فاتحہ پڑھ کر کہا اللہ تمہارا بھی حافظ ہے میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی راہ ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔ غرض جب شہر کے دروازہ پر پہنچا بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں کواڑ کھول دو تو شہر میں جا کر دانہ گھاس کا انتظام کروں۔ وہ اندر سے گڑک کر بولے اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں ہے اتنی رات گئے تم کیوں آئے۔ جب میں نے ان سے صاف جواب سنا تو شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے سے اتر کر زین پوش بچھا کر بیٹھا اور جاگنے کی خاطر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات ہوئی تو سنسان ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صندوق قلعہ کی دیوار پر سے نیچے اترا۔

(۲) قصۂ برادرانِ توام

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور، مرزا اصغر علی بیگ کے صاحبزادے تھے۔ مورخین کی رائے ہے کہ سرور لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا وطن اکبر آباد تھا۔ سرور کا خاندان نہایت معزز تھا اور انکی تربیت لکھنؤ کی ادبی فضا میں ہوئی جس نے انہیں ایک نہایت صاحب کمال ادیب بنا دیا۔ علاوہ ایک بلند پایہ انشا پرداز ہونیکے سرور فارسی و عربی کا بھی بہت اچھا علم رکھتے تھے۔ اسکے علاوہ خطاطی و موسیقی کے فنون میں بھی کامل تھے۔ اول الذکر میں محمد ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ فسانہ عجائب میں کیا گیا ہے۔ شاعری میں سرور آغا نوازش حسین عرف مرزا خانی متخلص بہ نوازش کے شاگرد تھے۔ بہ حیثیت انسان سرور ایک نہایت دلچسپ، زندہ دل اور خوش باش انسان تھے۔ ان کی گفتگو اور شخصیت دونوں میں حد درجہ جاذبیت تھی۔ علاوہ ہمعصری کے، سرور کے غالب سے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ چنانچہ آخرالذکر نے گلزار سرور پر ایک معرفانہ تبصرہ لکھا ہے۔ اور فسانہ عجائب کی تقریظ کے سلسلہ میں سرور کو اس عہد کا بہترین انشا پرداز تسلیم کیا ہے۔

۱۲۴۰ھ میں سرور، نواب غازی الدین حیدر کے حکم سے جلاوطن ہو کر کانپور آئے اور

یہیں انہوں نے فسانہ عجائب لکھا جس میں کانپور کی ہجو موجود ہے۔ اس مشہور قصہ کا سنہ تصنیف ۱۸۲۴ء ہے۔ ۱۸۲۶ء میں سرور کی زوجہ نے انتقال کیا اور اسی سال انکا تقرر واجد علی شاہ اودھ کے درباری شعراء میں ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں انہوں نے بادشاہ کے حکم سے شمشیر خانی کا ترجمہ کیا اور سرور سلطانی نام رکھا۔ ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۱ء تک انہوں نے کئی مختصر فسانہ لکھے جن میں سب سے زیادہ مشہور شرر عشق ہے جو نواب سکندر بیگم (بھوپال) کے حکم سے لکھا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں شگوفۂ محبت امجد علی خاں رئیس سندیلہ کے ایما سے تصنیف کیا۔ سلطنت اودھ کی بربادی کے بعد مہاراجہ بنارس نے سرور کی بڑی دستگیری کی اور مہاراجگان پٹیالہ اور الور بھی اُن کے ساتھ مراعات کرتے رہے۔

ایک انشا پرداز کی حیثیت سے سرور، ادب اردو میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے ایک عدیم المثال ادیب تھے۔ اور کوئی ایسا نہ تھا جو انکی برابری کر سکتا۔ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا سرور سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ انکا اسلوب، مدارج تحریر کی وہ کڑی ہے جسکے بغیر مدارج مابعد کی اہمیت کا ذہن میں آنا دشوار ہے۔ سرور کی تصنیفیں مقفیٰ عبارتوں میں ہیں۔ اور اس رنگ کا ان سے بہتر لکھنے والا اردو میں موجود نہیں گو اس طرز تحریر کی بنا، تصنع، تکلف اور آورد پر ہے مگر اپنے دائرے کے اندر سرور نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ حد درجہ منتظم اور مکمل ہے اور انہی خصوصیات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سرور ایک زبردست آرٹسٹ تھے۔ کسی زمانہ میں یہ طرز تحریر بہت مقبول تھا۔ تصانیف تو ایک طرف، مراسلت میں بھی اسی قسم کی تحریر کا رواج تھا۔ مگر اب

غالب کی تقلید میں یہ طرز بالکل متروک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا میدان بہت تنگ ہے اور زمانۂ حال کی ضروریات کے لئے کسی طرح کافی اور مناسب نہیں۔

سرور نے ۱۲۸۴ھ میں غالب سے ایک سال قبل انتقال کیا۔ علاوہ مذکورہ بالا تصانیف کے سرور کی اور بھی تصنیفیں ہیں جنکے نام گلزارِ سرور، شبستانِ سرور ہیں۔ انشائے سرور انکے خطوط کے مجموعہ کا نام ہے۔ ذیل کا قصہ، فسانۂ عجائب کے درمیانی فسانوں میں سے ایک ہے جس سے سرور کے اسلوب اور طرزِ تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جوگی نے کہا ایک شہر میں دو بھائی تھے توام پرورش یافتہ ناز و نعم روزگار دیدہ نیک اندیشہ۔ سوائے رشتۂ برادری کے سر رشتۂ دوستی باہم مستحکم تھا۔ مگر دونوں کی طبیعت متوجہ سیر و شکار بہت مصروف سیاحی دیار دیار تھی۔ ایک روز شکار کھیلنے جنگل میں جاتے تھے ہرن سامنے آیا۔ چھوٹے بھائی نے تیر لگایا کاری نہ لگا۔ ہرن کنوتیاں اٹھا بھاگا دونوں نے تعاقب کیا۔ تمام دن رواں دواں افتاں و خیزاں چلے گئے۔ قریب شام بڑے بھائی نے جو تیر مارا ہرن ڈگمگا کر گرا۔ یہ گھوڑوں سے اترے ذبح کیا۔ دن بھر کی دوڑ سے گھوڑے بے تاب، خود بھی مضمحل ہو گئے تھے۔ تمام روز کے بے دانہ و آب بھوک پیاس سے بیتاب تھے۔ لکڑیاں چنکر پانی بہم پہنچایا، کباب لگائے۔ بخوبی تمام دونوں نے کھائے۔ مگر اس روز جو کیفیت اور لذت خشک کباب میں پائی مرغ ریزہ پائی تر ترائی کبھی ایسی نہ کھائی تھی۔ پانی پیتے ہی سستی معلوم ہوئی۔ رات بھی ہو گئی تھی لیکن شبِ ماہ پورنماشی کا چاند۔ اللہ اللہ جنگل کی فضا سبزہ نورستہ جا بجا۔ انہوں نے

کہا آ چکی شب اس صحرا میں سحر کیجئے چاندنی کی بہار صنعت پروردگار دیکھ لیجئے پھر دل میں سوچے کہ تنہائی کی چاندنی گور کے اندھیرے سے بدتر ہے سچ ہے جب ماہ رو بر میں اور نور نظر میں نہ ہو اندھیرا اجالا آنکھ میں برابر ہے۔ شیخ ناسخ۔

دھوپ بہتر ہے شب فرقت کی بدتر چاندنی
صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی

خیر یہ دونوں ایک درخت سایہ دار چشمے کے قریب دیکھ نظر بچی چاندنی کہ ہمراہ نہ تھی زین پوش چاندنی کے عوض بچھا چاندنی کی سیر کرنے لگے باگ ڈور سے گھوڑے اٹکا دیئے چھوٹا بھائی بڑا متین ذی شعور نکتہ سنج دوربین تھا بڑے بھائی نے کہا آج ہم تمہاری عقل کا امتحان کرتے ہیں بتاؤ تو اس وقت ہمارے شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے اور سمت کونسی ہے دوسرے کباب کی لذت پانی کا مزا آج بہت ملا اس کا سبب کیا تھا اس نے جواب دیا یہ باتیں سہل ہیں شہر ہمارا یہاں سے سو کوس ہے اور دلیل یہ ہے کہ بارہا تجربہ کیا ہے میرا گھوڑا تمام دن میں سو کوس اسی چال سے پہنچتا ہے اور سمت ستاروں سے ثابت ہے کہ شمال ہے رہا کھانے پانی کا لطف خلاف وقت سے تھا الاشیا مقدمہ یہ سنئے یقین کامل ہے کہ صبح کو عنایت خالق اور مدد طالع سے وہ سامان مہیا ہو جو کدورت سابق دور ہو آئندہ آسائش رہے طبیعت مسرور ہو بڑے بھائی نے اسکی وجہ پوچھی اس نے کہا آج سو کوس کی مسافت بصد آفت طے کی بھوکے پیاسے رہے لیکن دل بشاش ہے وہ شگفتگی سبب ہو رہا۔ یہ قصہ رفت و گذشت ہو گیا۔ پھر مشورہ ہوا کہ یہ جنگل سنسان ہو کا مکان ہے

یہاں درندہ و گزندہ سانپ بچھو شیر بھیڑیئے کے سوا پرندہ دوندہ نظر نہیں آتا
جو ہم تم دونوں سو رہیں خدا جانے کیا ہو تین پہر رات باقی ہے ڈیڑھ پہر ہم جاگیں پھر تم
ہوشیار رہو یہ صلاح پسند خاطر طرفین ہوئی پہلے بڑے بھائی نے آرام کیا چھوٹے نے
جاگنے کا سرانجام کیا تیر و کمان ہاتھ میں اُٹھا ٹہلنے لگا جب زلف لیلائے شب کمر تک
آئی اُسی درخت پر دو جانور آپس میں اپنی اپنی توصیف و تعریف زبان ہزبانی میں
کرنے لگے اور یہ شخص بہت جانوروں کی بولی سمجھتا تھا آواز پر کان لگائے۔ ایک
بولا میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے جو کھائے ایک لعل تو پہلے دو پہر کے بعد اُگلے پھر
ہر مہینے مُنہ سے نکلے دوسرا بولا جو شخص میرا گوشت کھائے اُسی روز بادشاہ ہو جائے
وہ یہ باتیں سمجھ دل میں نہایت خوش ہوا تیر و کمان تو موجود تھا الا اللہ کہکر تیر بے
تامل چلّے سے جوڑ کر کھینچا لب سوفار کان کے پاس آیو عدہ نشانہ سرگوشی کر کے روانہ ہوا۔
قضا نے ہر چند اُنکے سر پر خبردار پکارا کمان کڑکڑا کر چلائی کہ وہ مارا رات کا بھر سراسری
اُدھ نکر لیس مگر مرگ جو درپے ہو گئی جان نہ بچی پیکان سے تا سوفار دو سارہ ہوا زمین پر
چھد کر دونوں ایک تیر میں گر پڑے اس نے تکبیر کہکر ذبح کیا طائر روح اُنکا اُڑ گیا دن
کی لکڑیاں بچی سُلگا کباب لگائے جس کے گوشت میں سلطنت کا ذائقہ سمجھا تھا۔
اُسے کھایا دوسرا بھائی کے واسطے اُٹھا کر رکھا اور ایسا خوش ہوا کہ تمام شب آپ
پاسبانی کی بڑے بھائی کو تکلیف نہ دی مگر معاملات قضا و قدر سے مجبور بشر ہے
انسان کے قبضہ قدرت میں نفع ہے نہ ضرر ہے۔ مصرع

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

شعر — آنچہ نصیب است بہم میرسد   گر نہ ستانی بستم میرسد

جس وقت زاغ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانہ مغرب میں چھپائے اور صیادانِ سحر خیز دام بر دوش آئے اور سیمرغ زریں جناحِ طلا بال غیرتِ لعل قفسِ مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گذری روز ہوا بڑا بھائی اٹھا چھوٹے نے وہ کباب پس ماندۂ شب یعنی رات کے بچے رکھے وہ نوش کر گیا اور حال کچھ نہ کہا دو گھڑی دن چڑھے جب لعل آگلا تب سمجھا ہم نے بہت تدبیر کی مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی پھر وہ لعل بطریق نذر روبرو لایا اور رات کا افسانہ مفصل سب کہہ سنایا۔ اللہ کی عنایت سے جلد آپ کو سلطنت حصول ہو یہ نذر غلام کی قبول ہو اسکو اسکی سعادتمندی سے خرسندی حاصل ہوئی پھر کہا سامنے آبادی معلوم ہوتی ہے ہم جا کر اس لعل کو کسی دلال کے ہاتھ بیچ آئیں تم گھوڑوں کے پاس رہو۔ اگر اپنے شہر چل کر یہ امر کریں گے حاکم کا خوف مانع کار ہے وہاں ایسا کہاں اعتبار ہے یہ کہکر اُدھر چلا جس دم شہر کے دروازے پر پہنچا خلقت کا انبوہ نظر پڑا اُس ملک کا یہ معمول تھا جب وہاں کا بادشاہ دارالسلطنت عدم کا تخت نشین ہوتا وضیع و شریف شہر کے سوم کی رسم کے بعد وزیر اعظم کے ہمراہ صبحدم تخت لئے دروازے پر آتے جو اُس روز پہلے مسافر باہر سے آتا اُسے بادشاہ بناتے۔ قضارا وہاں کا بادشاہ قضا کر گیا تھا لوگ تخت لئے منتظر تھے یہ داخل ہوا

سب نے تخت پر بٹھا نذریں دیں نوبت و نشان جلوس کا سب سامان موجود
تھا وہوم دھڑکے سے دیوان خاص میں داخل کیا منادی ہوئی بقول مشہور
ان کی دائی دہائی نزدیک و دور ہو گئی اس کو سرور سلطنت اور احکام مملکت
کے باعث اُس دن بھائی کا خیال نہ آیا دوسرے روز جب تخت پر رونق افروز
ہوا بھائی یاد آیا فوراً جاسوس ہرکارے درخت کا پتہ بتا روانہ کئے کہا
اس صورت کا جوان اور دو گھوڑے وہاں ہیں جلد حضور میں حاضر کرو
وہ سب دوپہر تک تمام جنگل کی خاک چھان حیران پریشان پھر آئے عرض
کی تمام دشت میں پھر کر پانوں توڑے آدمی ملا نہ گھوڑے، وہ کچھ رنجیدہ
ہو سلطنت کے شغل میں مشغول ہوا۔ بھائی بیچارے کو بھولے سے بھی کبھی
یاد نہ کیا۔ مگر وہ لعل جسے بیچنے کو لایا تھا جس کے بیعانے میں تخت و تاج
بیسر آیا تھا فال مبارک اور بے نشان بھائی کی نشانی سمجھ ہر روز
دربار میں لاتا ملازموں کو دکھاتا وہ سب بخاطر شاہ تعریف کرتے اُس کو
خوشی حاصل ہوتی۔

(۳) اردوئے معلیٰ

مرزا اسد اللہ خاں غالب

عوام کا خیال ہے کہ غالب اردو و فارسی کا صرف ایک مشہور شاعر تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت بلند پایہ نثر نگار بھی تھا۔ غالب کی نثر ضخامت و مقدار میں نظم سے زیادہ ہے۔ اردو نثر میں غالب کی تصانیف خطوط کا ایک مجموعہ، کچھ مقدمے تبصرے اور تین مختصر رسالے لطائف غالب، تیغ تیز، نامۂ غالب ہیں جو حامیان برہان قاطع کے حملوں کے جواب میں لکھے گئے۔ اسکے علاوہ ایک ناتمام قصہ کے کچھ اجزا بھی ہیں۔ غالب کی نثر میں سب سے زیادہ دلکش اور دلاویز اُنکے خطوط ہیں جو دو جلدوں میں اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی ملکی زبان تھی۔ یہاں تک کہ خطوط بھی اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۰ء تک جب انہوں نے مہر نیمروز مکمل کی، غالب کو بھی فارسی سے شغف رہا۔ مگر اسکے بعد سے انہوں نے غالباً اردو کی طرف توجہ کی۔ غالب کے خطوط کا طرز تحریر، جو اُنکے مخصوص رنگ کا حامل ہے نہ صرف حد درجہ دلکش و دلاویز ہے بلکہ ناقابل تقلید بھی ہے۔ انکا انداز ہر قسم کے تصنع اور تکلف سے یکسر معریٰ ہے۔ اور آورد کا کہیں نام و نشان نہیں معلوم ہوتا ہے کہ

دل سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جو بغیر کسی غور یا کاوشِ ذہنی کے قلم برداشتہ لکھ دی گئی ہیں۔ ان خطوں کی زبان میں اصل روزمرہ کا لطف موجود ہے مگر خوبی یہ ہے کہ کہیں ابتذال کا شائبہ نہیں بلکہ ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ ان لطائف کے ساتھ ایک نمایاں سادگی، اور اسکے پہلو بہ پہلو شوخی و ظرافت ایسے محاسن ہیں جو ان خطوط کو حد درجہ ممتاز کر دیتے ہیں۔ غالب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بغیر کسی پس و پیش کے، نہایت جرأت کے ساتھ، بلا لحاظ نتائج اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ انہیں اس کا بھی پورا اعتماد ہوتا ہے کہ ان کا اخلاص اور صفائی قلب مکتوب الیہ کی محبت میں اضافہ کئے بغیر نہ رہیں گے۔ ان خطوط میں ایک ایسی بیساختگی، روانی اور سلاست ہے جو ان سے قبل، اردو فارسی مکتوبات میں کہیں پیدا نہیں۔ غالب کے خطوط بالکل اُن کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی جب وہ سادہ بیان چھوڑ کر مکالمہ پر آجاتے ہیں تو ناول یا ڈرامے کا لطف آنے لگتا ہے۔ چند ہی فقروں سے وہ ایک ایسی جیتی جاگتی تصویر سامنے لا کھڑی کرتے ہیں جس میں جا بجا آثارِ حیات نظر آنے لگتے ہیں۔ غالب ایک مکمل آرٹسٹ ہیں۔ اور انکے آرٹ کے مظاہر انکے مکتوبات میں بھی موجود ہیں

غالب کے خطوط کی اہمیت اور متاخرین کے اسلوب پر اُن کا اثر

اُن کے خطوط کی اہمیت بے پایاں ہے۔ مکتوبات کی دنیا اور اس قسم کے اندازِ تحریر میں اُن خطوط نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ انشائے قدیم کے وہ بھونڈے اور بارِ خاطر اجزائے لاینفک یعنی القاب و آداب اور خطوط کے وہ ابتدائی حصّے جو ہمیشہ نہایت طویل، غیر منتظم اور غیر ضروری ہوا کرتے تھے غالب نے یک قلم ترک کر دیئے۔ بہت سے خطوط

صاحب، میاں، بھائی، حضرت، پیر و مرشد، قبلہ، میری جان، ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے القاب خطوط میں وہ معائب پیدا نہیں ہونے دیتے جن کی وجہ سے اس عہد کے علما کے خطوط بھونڈے اور بدنما ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک نہایت ضروری اصلاح تھی اور اس کے ذریعہ تصنع، تکلف، اور علمیت کی نمائش بیجا سے اردو کی بریت ہوگئی۔ اس قسم کی صاف اور آزادانہ تحریر کو جو ان خطوط کے ذریعہ سے پیش کی گئی، اس عہد کے فضلا نے حد درجہ ناپسند کیا۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سادہ نثر کی ضرورت کا احساس ہونے لگا تو اس طرز عبارت کو بھی قبولیت اور پسندیدگی حاصل ہونے لگی اور اسکے بہت سے مقلد پیدا ہو گئے۔ مگر حق یہ ہے کہ غالب کا اسلوب ناقابل تقلید ہے اور ابتک کوئی شخص، بڑھ جانا تو کجا اسکی برابری کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اصلاف پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ حالی نے اسے کچھ ترمیمات کے ساتھ بطور نمونہ اختیار کیا اور کامیاب ہوئے سرسید، ذکاء اللہ، آزاد اور دیگر متاخرین بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ تحریر کا یہ سادہ اور معری اسلوب، کاروباری اور سنجیدہ ادب کے لئے نہایت موزوں تھا اور غالب نے جو اصلاح کی وہ نہایت مناسب تھی۔ اور چند روز بعد نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی اور عام ہوئی۔ ان خطوط میں تزک و تذکرے کا بھی لطف شامل ہے۔ یعنی یہ کہ ان سے غالب کے حالات زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہ انکی شخصیت اور ان کے عادات و خصائل کا آئینہ ہیں۔ اور آن تفصیلات کو نمایاں کرتے ہیں جن کے یکجا کرنے سے غالب کی حیات کا پورا قصہ مع ان کے ذاتی خصوصیات، نظریہ حیات و ادب اور ان تعلقات کے

جو احباب و معاصرین سے تھے، پیش نظر ہو سکتا ہے۔ ان محاسن کے علاوہ یہ خطوط لطیف ظرافت سے پُر ہیں۔ اور یہ انہی خطوط کا فیضان ہے کہ ادب اردو کے دامن سے یبوست کا داغ دھویا جاسکتا ہے۔ پھر یہ کہ انکی تاریخی اہمیت بھی ہے اور انیسویں صدی کے وسط کے واقعات و حوادث اور معاشرت کی مکمل تصویریں ان میں ملتی ہیں۔ باوجود اس مذاق اور اتنی بلند پایہ شخصیت کا مالک ہونیکے غالب زمانہ کے اثر سے خالی نہ رہ سکے۔ اس لئے انہیں بعض تقریظیں اور تبصرے مقفیٰ عبارت میں بھی لکھنے پڑے جو اب تک موجود ہیں۔ غرض کہ غالب اردو زبان کے محسنین میں سے ہیں۔ اور ان کا مرتبہ نثر نگاری میں اتنا بلند ہے کہ اب تک کسی ادیب کو اس بلندی پر پہنچنا میسر نہیں ہوا۔ انہوں نے ایک نئے عہد کی ابتدا کی اور یہ ایک ایسے طرز کے بانی ہیں جو اردو کے نشاۃ الثانیہ کا سنگ بنیاد ہے۔

تصانیف نثر:۔ اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی، نکاتِ غالب۔

بنام مرزا حاتم علی صاحب مہرؔ

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

علاقۂ محبتِ ازلی کو برحق جانکر اور پیوندِ غلامی جناب مرتضیٰ علیؑ کو سچ جانکر

ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اس کے اجارے میں آئی ہے۔ یہ بھی دلیل آشنائی ہے کیا فرض ہے کہ جینک دیدوا دید نہ ہولے اپنے کو بیگانہ سمجھیں البتہ ہم تم

دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے خط جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا تھا آپ کی نظر سے گذر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب ہر زا لتفتہ سے لیکر پڑھ لیجیے گا۔ اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے پڑھ لینے سے دوبالا کیجیے گا۔ ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اُس کا یہ شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انہیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزار ہا دوست مر گئے کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں مروں تو کوئی عزادار نہیں۔ غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ چشم بد دور۔ اردو کی راہ سے تو سالک ہو، گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں مشق نثر جاری اگر کیے جاؤ گے لطف پاؤ گے میرا تو گویا بقول طالب آملی اب یہ حال ہے ۔ شعر

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے خط مجھ کو لکھا ہو تو کیونکر مجکو اپنے خط کے جواب کی نہ تمنا ہو۔ پہلے تو اپنا حال لکھیے کہ میں نے سُنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں، پھر اب اکبر آباد میں کیوں خانہ نشین ہیں۔ اس ہنگامہ میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی۔ راجہ بلوان سنگھ کا بھی حال لکھنا ضرور ہے کہ کہاں ہیں۔ اور وہ دو ہزار روپیہ مہینہ جو انکو سرکار انگریزی سے ملتا تھا اب بھی ملتا ہے یا نہیں۔ ہائے لکھنؤ، کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گذری۔ اموال کیا ہوئے اشخاص کہاں گئے

خانداں شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا۔ قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوگی امیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ بنا مسکن مبارک کا کشمیری بازار سے زیادہ نہیں معلوم ہوا اظہار اسی قدر کافی ہوگا ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔ مرزا تفتہ کو دعا کہئے گا۔ اور انکے اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دیجئے گا جس میں آپ کے خط کی انہوں نے تقریظ لکھی تھی والسلام۔

ایضاً

بھائی صاحب۔ از روئے تحریر مرزا تفتہ آپ کا چھ کتابوں کی طرف متوجہ ہونا معلوم ہوا۔ پھر بھائی منشی نبی بخش نے دوبارہ لکھا کہ میں باجمال لکھتا ہوں مفصل مرزا حاتم علی صاحب نے لکھا ہوگا۔ یارب ان کے دو خط آگئے مرزا صاحب نے اگر لکھا ہوتا تو انکا خط کیوں نہ آتا۔ اپنے حسن اعتقاد سے یوں سمجھا کہ نہ لکھنا مقتضائے یکدلی ہے جب اپنا کام سمجھ لئے تو مجھ کو لکھنا کیا ضرور ہے۔ مگر اس کو کیا کروں کہ جواب طلب باتوں کا جواب نہیں۔ مطبع اخبار آفتاب عالمتاب میں یکم ستمبر ۱۸۵۸ء حال سے حکیم حسن اللہ خاں کا نام لکھوا دیا اور دو نمبروں کا اخبار ایک بار بھجوا دیا۔ اور آئندہ ہر ہفتہ اسکے ارسال کا طور ٹھہرا دیا۔ کیوں صاحب یہ امر ایسا دشوار تھا کہ آپ نے نہ کیا۔ اور اگر دشوار تھا تو اسکی اطلاع دینی کیا دشوار تھی۔ ابھی شکایت نہیں کرتا پوچھتا ہوں کہ آیا یہ امور مقتضی شکایت ہیں یا نہیں۔ مرزا تفتہ کے ایک خط میں یہ قصہ بھی لکھ چکا ہوں۔ کیا انہوں نے بھی

وہ خط تم کو نہیں پڑھایا۔ ہرچند عقل دوڑائی کوئی درنگ کی وجہ خیال میں نہ آئی۔ اب حصول مدعا سے قطع نظر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ دیکھوں چھ مہینے بعد بیس دن بعد اگر مرزا صاحب خط لکھتے ہیں تو اس امر کا خاص جواب کیا لکھتے ہیں میں بھی شاعر ہوں اگر کوئی مضمون ہوتا تو میرے بھی خیال میں آجاتا کوئی عذر ایسا میرے ذہن میں نہیں آتا کہ قابل سماعت کے ہو۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیا لکھتے ہو۔

ایضاً

صاحب میرے۔ عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجئے پریوں کو تسخیر کیا کیجئے۔ مثنوی پہنچی۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں کیا خوب بول چال ہے انداز اچھا۔ بیان اچھا۔ روزمرہ صاف۔ حبشیوں کا استغاثہ کیا کہوں کیا مزہ دے رہا ہے۔ اس مثنوی نے اگلی مثنوی کو تقویم پارینہ کر دیا۔ بیان بخشائش ہم گنہگاروں تک کیوں پہنچے گا۔ مگر ہاں اس راہ سے ع کہ مستحق کرامت گناہگار انند بخشش کا متوقع ہوں میں ابھی تک یہ نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ نظم ہے یا نثر ہے اور مضمون اس کا کیا ہے۔ مرزا یوسف علی خاں آٹھ دس مہینے سے مع عیال و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرایہ کو لے لیا ہے اس میں رہتے ہیں۔ اگر ان کو خط بھیجو تو میرے مکان کا پتہ لکھ دینا اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ میرے خط کے سرنامہ پر محلہ کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شرط

نام اور میرا نام قصہ تمام۔ ہاں یار عزیز کے خط پر میرے مکان کے قریب کا پتہ ضرور رہے
دو روز سے شجاع مہر کو دیکھ رہے ہیں اکثر تمہارا ذکر خیر رہتا ہے وہ نواب ہر وقت
یہیں تشریف رکھتے ہیں رات کو تو پہر گھڑی کی نشست ہر روز رہتی ہے ابھی یہیں سے
اٹھ کر گئے ہیں۔ تم کو سلام کہتے ہیں۔ اور شجاع مہر کو مداح اور بیان بخشائش کے
مشتاق ہیں۔

ایضاً

جناب مرزا صاحب۔ آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علیخاں عزیز
کو پڑھوا دیا انہوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی
اس کی اطاعت اور تمہاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو
صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی
تین فن میں سردفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی
انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی
نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے
بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری بھئی مغل بچے
بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں میں بھی مغل بچہ ہوں۔
عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو
بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔

چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے تاآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گذرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑ دو۔ شعر

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

اللہ بس ماسویٰ ہوس۔

ایضاً

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب

اے تو غایب ز نظر مہر تو ایمان نیست

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا۔ جانتے ہو کہ مرزا محمد یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا اُس کا منشا کیا ہے۔ کبھی میں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں۔ اور بھائی تمہاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانہ میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھے اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہرحال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔

تمہارے گندمی رنگ پر رشک آیا کس واسطے کہ جب جیتا تھا تو میرا رنگ
چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ
اپنا رنگ یاد آتا ہے چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور
میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے وہ مزے
یاد آ گئے کیا کہوں جی پر کیا گذری۔ بقول شیخ علی حزیں۔ شعر

تا دسترسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر
نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی
بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی
ہے عام ملا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ۔ بھٹیارہ۔ جولاہہ۔ کنجڑا منہ
پر ڈاڑھی سر پہ بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولا
قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔ صاحب۔ بندہ نے دستنبو جناب
اشرف الامرا جان جے فریڈرک۔ ایڈمنسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال
کو نذر بھیجی تھی سو انکا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی
بطریق ڈاک آ گیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کی قصیدہ فارسی بھیجا
اسکی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی بسبیل ڈاک مرقومہ

چہاردہم آگیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب
لفٹنٹ گورنر پنجاب کی خدمت میں بواسطۂ صاحب کمشنر بہادر دہلی بھیجا تھا کل
اُن کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا پنشن کے باب میں ابھی کچھ
حکم نہیں۔ اسباب توقع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا
ہی نہیں ہوں۔ آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق سچا ہے تو یہ غزل
اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام وہ آپ پہنچا دیں گے۔

(۴) رسم ورواج

تہذیب الاخلاق

(سرسید احمد خاں)

سید احمد خاں جو ایک نہایت معزز خاندان سے تھے ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباو اجداد شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور معزز عہدوں پر مامور ہوئے۔ عالمگیر ثانی نے ان کے دادا کو نواب جوادالدولہ کا خطاب دیا تھا اور یہی خطاب بعد کو سید احمد خاں کو بھی مرحمت ہوا۔ ان کے والد میر تقی کو جو ایک نہایت ذی رفعت بزرگ تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے اپنی وزارت کا عہدہ بخشنا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ سید احمد خاں کی والدہ عظیم النساء بیگم نے جو ایک نہایت روشن خیال خاتون تھیں ان کی تربیت کی اور ضروری تعلیم دی۔ سید احمد، غالب، صہبائی، آزردہ، مفتی صدر الدین، شیفتہ، مومن، نواب ضیاء الدین احمد خاں اور دوسرے علماء عہد کی صحبت میں رہے اور وہیں ان کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں انہوں نے بہ حیثیت سررشتہ دار دہلی میں ملازمت شروع کی۔ ایک سال بعد نائب میر منشی مقرر ہوئے اور ۱۸۴۱ء میں امتحان پاس کرکے منصفی کے عہدے پر فائز ہوئے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی

میں صدر امین رہے۔ اور اسی زمانہ میں انہوں نے اپنی کتاب مشہور آثار الصنادید تصنیف کی جو عمارات دہلی کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا۔ اور اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو گیا۔ گارسن ڈی ٹاسی نے ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ شائع کیا۔ اس کے بعد برابر تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں سید احمد خان نے مختلف طریقوں سے انگریزوں کی مدد کی۔ اس کے صلہ میں انہیں ایک بڑا تعلقہ پیش کیا گیا مگر انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور کو ہوا اور وہاں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڈھ آ گئے اور سوسائٹی بھی اُنکے ساتھ وہاں منتقل ہوئی۔ ۱۸۶۹ء میں مختلف ضروری کام انجام دینے کے بعد انگلستان تشریف لیگئے اور وہاں سی، ایس، آئی کا خطاب حاصل کیا۔ وہاں کے قیام کے زمانہ میں اہل یورپ کے رسم و رواج، عادات خصائل، آداب و اخلاق، تہذیب و تمدن، تعلیمی مذہبی اور سیاسی حالتوں کا غائر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد رسالۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کا مقصود مسلمانوں کی اخلاقی و تمدنی اصلاح تھا۔ اس رسالے نے مسلمانوں کے لئے وہی کام کیا جو ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر، اسٹیل اور ایڈیسن کے رسائل نے اہل انگلستان کے لئے کیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید نے سرکاری ملازمت سے پنشن لی۔ اور تعلیمی، سیاسی و معاشرتی معاملات کے لئے اپنے کو وقف کر دیا۔ آپ نے ۱۸۹۸ء میں انتقال فرمایا اور تمام ہندوستان کو سوگوار کر گئے۔

اسلوب اردو کی دنیائے صحافت میں سرسید کی ذات اپنے مقام پر عدیم المثال

گذری ہے۔ سلاست و روانی کے ساتھ اُن کی تحریر میں جو زور اور اثر ہے وہ دوسری جگہ مشکل سے ملتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بالکل صاف صاف اور نہایت سادہ زبان میں کہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کسی قسم کی ادبی رنگینیاں نہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر ایسی باتیں ملتی ہیں جو قواعد صرف و نحو کے خلاف ہیں۔ مگر انہیں اس کی پرواہ نہ تھی۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو پیغام انہیں پہنچانا ہے وہ سادہ ترین لفظوں میں بیان کر دیا جائے۔ اس لئے قواعد کی خلاف ورزیوں کا انکی ادیبانہ شہرت و وقعت پر کوئی اثر نہیں۔ ان کے طرز تحریر نے ظہوری اور بیدل کے طرزوں کو غیر مقبول اور ناپسندیدہ بنا دیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں سادہ نثر بھی اسی کمال کے ساتھ لکھی جا سکتی ہے۔ سرسید کے یہاں الفاظ مطالب کے ماتحت ہیں۔ ان کا مقولہ یہ تھا کہ معانی زیادہ اور تضیع کم ہونا چاہیئے۔ تحریر کے علاوہ تقریر میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ وہ بھی اسی قدر سادہ اور تکلف سے معری ہوتی تھی۔ زبان پر قدرت ان کی دوسری خصوصیت ہے۔ کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی لفظ کی کمی محسوس ہوئی۔ حالؔی کا خیال ہے کہ سرسید اردو نثر کے آدم ہیں۔ بڑے سے بڑے دقیق اور علمی مسائل کو وہ ایسی سادگی اور صراحت سے بیان کر جاتے ہیں کہ ان کی قوت مصوری اور زبان دانی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

تصانیف:-

تفسیر القرآن، تبیین الکلام، مضامین تہذیب الاخلاق، خطبات احمدیہ، اسباب بغاوت ہند، تفسیر السموات، فضائل الامام، ابطال غلامی، النظر فی بعض مسائل، تحریر

فی اصول التفسیر، احکام طعام اہل الکتاب، تزقیم فی قصہ اصحاب کہف، جواب امہات المومنین، الدعاء والاستجابۃ، ایک ناداں خدا پرست، انشاء اللہ، خلق الانسان، الجن والجان، مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی، تنزل علوم دینیہ، مہدی آخرالزماں، اسلام، کانشنس، مکمل مجموعہ لیکچر، سیرۃ فریدیہ، خطوط سرسید، انتخاب مضامین، ازالۃ الغین۔

ذیل کا مضمون تہذیب الاخلاق کے مضامین میں سے ہے۔

جو لوگ کہ حسن معاشرت اور تہذیب الاخلاق و شائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں ان کے لئے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو بُرا ٹھیرانا نہایت مشکل کام ہے۔ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے۔ کیونکہ جن باتوں کی بچپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہوا اور عادت نہ پڑی وہی بُری ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور برائی فی نفسہٖ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا۔ عیب نہیں لگاتا۔ کیونکہ سب کے سب اس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہٖ بُری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کے رسومات

کے اچھے ہونے پر بھروسہ نہ کرلینا چاہئے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات جو حقیقت میں بد ہو اور بہ سبب رسم و رواج کے ہم کو اسکی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔ البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اُس کے رواج اور عدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے تو ہم کس طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جبکہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بُرائی یا بھلائی فی نفسہ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا بُرائی قرار دینے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کے تلاش کرنے اور اُسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا بُرائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہئے۔ سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لئے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سُننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں اور اُس دلی نیکی سے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا بُرائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہئے تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اسکے چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو اُن میں بڑی ہے اُس کے اختیار کرنے

سے بچتے رہیں۔ جبکہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسوم و عادت مروج ہیں انہوں نے کس طرح اُن قوموں میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے ان رسومات و عادات کے اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروج ہیں ان کا رواج یا تو ملک کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا ان اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسری قوم کی تقلید و اختلاط سے مروج ہوگئی ہیں یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہراً یہی چار سبب ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا ابتداء و منشاء معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُن کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرتاً اور فطرتاً ان کو سکھلائی ہیں جبکے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف انکے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔ مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لئے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں عمدہ قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی

گرمی سے فائدہ اُٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکا پھریں جس سے گورگورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسان میں ترقی پاتا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی آن پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنہوں نے ترقی کی ہے ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کئے جاویں گے پھر خواہ اس نام سے ہم برا مانیں یا نہ مانیں۔ انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور نا تربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ و تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر و ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا شکایت ہے۔ ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو ہمکو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیئے۔ دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر تاہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اُس قوم سے زیادہ فائدہ

اُٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم کو اُس رسم سے موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اسکی حقیقی بھلائی یا برائی پر غور کرنے کا بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں بہت اچھا موقع ملتا ہے اُس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسمیں جاری ہیں ہم کو بہت عمدہ مثالیں سینکڑوں برس کے تجربہ کی ملتی ہیں جو اُس رسم کے اچھے یا بُرے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔ مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ اور بغیر قصد و ارادہ کے اور اُن کی بھلائی اور برائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملات زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں یا کوئی نئی رسم مشابہ اس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے۔ مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچا دیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظر تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں اُنکو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں اُن میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اُس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی

ہوتی ہیں۔ اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور تمام قسم کے حالات ترقی یا تنزل مراد لیے ہیں خواہ وہ ترقی یا تنزل اخلاق سے متعلق ہو۔ خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت و تمدن سے اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے۔ بلاشبہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں مگر اتنا فرق بیشک ہے کہ بعض قوموں میں ایسی رسومات اور عادات جو درحقیقت نفس الامر میں بری ہوں کم ہیں اور بعض میں زیادہ اور اسی وجہ سے وہ پہلی قوم پچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے اور بعض ایسی بھی قومیں ہیں جنہوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے اور اس حالت انسانی کی ترقی نے اُن کے نقصانوں کو چھپا لیا ہے جیسے ایک نہایت عمدہ و نفیس شیریں دریا تھوڑے سے گدلے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ نیبو کی کھٹی دو بوندوں سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اور یہی قومیں ہیں جو اس دنیا میں سویلائزڈ (مہذب) گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

(۵) بھاشا پر فارسی نے کیا اثر کئے

(مولوی محمد حسین آزاد)

مولوی محمد حسین آزاد انیسویں صدی کے تیسرے ربع میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ انکے والد ماجد کا اسم گرامی مولوی باقر علی تھا۔ آزاد ذوق کے شاگرد تھے اور انہی کی صحبت میں انکی تربیت ہوئی۔ آزاد کی زندگی کے واقعات نہایت دلچسپ ہیں جس میں کلکتہ کابل بخارا اور ایران کے سفر بھی شامل ہیں۔ آزاد فارسی کے بڑے متبحر عالم تھے اور ایران کے سفر نے اس علم پر اور جلا کر دی۔ ۱۸۸۷ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب مرحمت ہوا ۱۸۸۹ء میں آزاد کو خلل دماغ کی بیماری پیدا ہوئی۔ جو ذہنی کاوشوں، مصائب سفر اور پیاری بیٹی کی موت کے غم کا نتیجہ تھی۔ اور جسکی وجہ سے ان کی ادبی زندگی جو حد درجہ مفید اور سود مند تھی ختم ہوگئی آخر کار ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

آزاد، جدید ادب اردو کی سب سے زیادہ نمایاں اور منفرد شخصیت ہے، یہ دعویٰ محض انشاپردازانہ حیثیت سے نہیں حقیقت یہ ہے کہ انکی ذات بہت سی خصوصیات کی حامل تھی۔ جن سب کے مفصل بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔ ایک عدیم المثال ادیب ہونے کے علاوہ وہ ایک بلند پایہ شاعر و نقاد بھی تھے۔ شاعری میں انہیں طرز جدید کے موجدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر وہ بات جو ان کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے انھیں غیر فانی

بنادیا ہے، ان سب باتوں سے جدا ہے۔ وہ ان کا طرزِ تحریر، یا اسلوب نگارش ہے۔ آزاد کی سادگی ناقابلِ تقلید ہے اور اس سے بڑھ جانا تو محالات سے ہے۔ آزاد کا سا اسلوب، ابتک، کوئی نہیں اختیار کرسکا۔ حق یہ ہے کہ آزاد نے زبان کا حق ادا کیا ہے۔ اور اس لئے انہیں اردو کا سب سے بڑا ادیب کہنا چاہئے۔ ان کے یہاں ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کا پتہ نہیں۔ فارسی ترکیبوں اور فارسی محاورات سے انکی تحریر یکسر معرّیٰ ہے انکی تحریر میں بھاشا کی دلکشی، انگریزی کی صفائی اور سادگی اور فارسی کا حسن ادا یکجا ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب سب سے الگ تھلگ اور آپ اپنی مثال ہے۔ ان کے یہاں کوئی بات بار بار دہرائی نہیں جاتی، بلکہ، ایک ہی دفعہ ایسے موثر طریقہ پر کہدی جاتی ہے کہ دل میں اثر کرہی جائے۔ سلاست وروانی ہر مقام پر پائی جاتی ہے اور جس طرح یہ خصوصیات ہر جگہ موجود ہیں، اسی طرح، آورد اور تصنع یک قلم عنقا ہیں۔ جگہ جگہ نہایت دلکش تشبیہات سے کام لیا گیا ہے صنعت حسن التعلیل انکی ایک پیش پا افتادہ خوبی ہے مگر الفاظ سے جو موسیقی پیدا ہوتی ہے وہ جملہ خصوصیات سے افضل تر ہے۔ آزاد کا اگر انگریزی انشاپردازوں سے مقابلہ کیا جائے، تو بلاخوف تردید انہیں، ڈی کوئنسی، لیمب، اور اسٹیونسن جیسے ممتاز ادیبوں اور مالکان اسلوب کا ہم پلّہ گردانا جاسکتا ہے۔

تصانیف نثر: آب حیات، سخندان پارس، دربار اکبری، نیرنگ خیال، قند پارسی نصیحت کا کرن پھول، سپاک و نماک، جانورستان، نگارستان فارس، آبحیات سیر ایران، مجموعہ مکتوبات آزاد، آموزگار فارسی، لغت آزاد، تذکرہ علما۔

ذیل کا مضمون آبحیات سے ماخوذ ہے۔

بیان مذکورۂ بالا سے تمہیں اجمالاً معلوم ہوگیا کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت
اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ
ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا۔ اور اُن کے معتقد باقی تھے
وہ استعارہ اور تشبیہہ کے لطف سے مست تھے۔ اسواسطے گویا اردو بھاشا
میں استعارہ و تشبیہہ کا رنگ بھی آیا۔ اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر
آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی
دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اسکی شدت نے ہماری قوت بیان کی
آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ
بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اُردو میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ چاہتا ہوں کہ دونوں
کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر ان کے فرق دکھاؤں۔ مگر اس سے پہلے دو تین
باتیں خیال میں رکھنی چاہئیں۔ اول تو شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی
کے دودھ سے پرورش پائی۔ اس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور
مبالغہ کے مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے
جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے، اور بھاشا کے طبعی مخالف
تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اُردو کے
خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہوگئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور
ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ آن پڑھ

انجان یا غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو منہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ کیا کہا
اُردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگہی رکھنے
فارسی اور اُردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے۔ اور ہندی کی
میں آسانی ہے اس میں ایک باریک نکتہ غور کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ بھاشا
جس شئے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت انہیں ان خطّ و خال سے سمجھاتی
جو خاص اسی شئے کے سُننے سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے
اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں
ہوتی ۔ مگر سننے والے کو جو اصل شئے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا
برخلاف شعرائے فارس کے یہ جس شئے کا ذکر کرتے ہیں صاف اسی کی بُرائی
بھلائی نہیں دکھا دیتے ۔ بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شئے جسے ہم نے اپنی
جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے اس کے لوازمات کو شئے اول پر لگا کر ان کا
بیان کرتے ہیں ۔ مثلاً پھول کی نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے
مشابہ ہے ۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھانا ہو تو
کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے
لگا ۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے ۔ خواجہ وزیر ۔ وزیر ے

ہوں وہ بلبل جو کرے توبخ نغا تو ہو کر
روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

یہ تشبیہ اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے لیکن جب دور دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل اوج اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینہ میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اول تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اُس ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا۔ اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے۔ وہاں انکے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اُس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے۔ جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

دوسرے فقرے ہیں۔ اول تو علمائے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے۔ اس پر طبقۂ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں اور روایات ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے

اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی۔ تو لطف زبان کجا اور یہ نہیں تو تاثیر کجا! مزا وہی ہے کہ آدھی بات کہی آدھی منہ میں ہے اور سننے والا پھڑک اٹھا۔ نار یا جا اور راگ پوچھا۔ ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی اور محسوسات میں عیاں ہیں ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اول اشیاے بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اسکے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں ان بیجانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

مثلاً رات کو اہل محبت کے جلسہ میں اول تو ساقی کا آنا واجب ہے۔ پھر معشوقہ بجائے ایک نازنین عورت کے پریزاد لڑکا ہو۔ اس کی پیشانی اور رخسارہ سے نور صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اسی لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی چھلکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل حق حق ہو کر یاد الہیٰ میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے منہ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن کبھی پھیلاتا ہے۔ فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے مگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینہ کے پار جاتا ہے پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں

پھوٹتی کہ عاشق کی صبح مراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع برق فانوس میں تاج زر
سر پر رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشقِ زار
آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنسلاتے ہیں۔ اور شمع کو عاشق کے
غم میں رُلاتے ہیں۔ وہ بادہ فا عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے اسکی چربی گھل گھلکر
بہتی ہے مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری
کبھی آکر کافور دیتا ہے اور کبھی تباشیر۔ شمع کا دل اس لئے بھی گداز ہے کہ
شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریبان
چاک کرتی ہے۔ عاشق بادہ خوار کے لئے مرغ سحر بڑا موذی ہے۔ اس کے
ذبح کو ہمیشہ تیغ زبان تیز رہتی ہے۔ باد سحر قاصد خجستہ گام ہے کہ پیغام یار کا
بہت جلد لاتا اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعلے سے آنکھ
ملتا سر برہنہ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے کبھی فلک کے سبزہ گھوڑے پر سوار کرن
کا تاج زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اُڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف شاہ انجم
کی فوج کو پریشان کر کے فتحیاب آیا ہے۔ ان ہی بنیادوں پر جب گلزار کی
شگفتگی۔ یا باغ کی بہار دکھانی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے کہ شاہد
گل کے کان میں قاصد صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا کہ وہ مارے ہنسی کے
فرش سبزہ پر لوٹ گیا طفل غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبل شیدا کا دل بہلاتا
ہے کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے تو گل اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لیکر

روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے۔ اس کا چہرہ چمن ہے گل رخسار ہیں سنبل بال ہیں۔ بنفشہ زلف ہے۔ نرگس آنکھیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پھر بہار موسم جوانی ہے۔ درخت جوانان چمن ہیں کہ عروسانِ گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں۔ شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ تاک کا سبزہ مست پڑا اینڈتا ہے۔ اطفال نبات دایہ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردۂ صد سالہ میں دمِ عیسوی کا کام دیتی ہے۔ مگر بلبل زار عشق شاہد گل میں اداس ہے۔ آب رواں عمر گذراں ہے اسکی موج کی دار سے دل کٹے جاتے ہیں۔ سرو کے عکس کا اژدہا نگلے جاتا ہے۔ شبنم کے آنسو جاری ہیں۔ بلبل کبھی خوش ہے کہ گل اس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے۔ کبھی افسردہ ہے کہ خزاں کا خونریز اں سب کو قتل کریگا یا اس کے دشمن یعنی گلچین و صیاد اُسے یہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق میں قمری کا گیرو الیاس ہے اسکے نالے کا آرا دلوں کو چیرتا ہے۔ کبھی عاشق زار بھی یہیں آنکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت و غم سے ہمکنار ہے۔ روتا ہے اور قاصد صبا کو پیغام دیتا ہے کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا۔

بیان مذکورۂ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو

خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اسکے علاوہ بعض خیالات میں اکثر ان داستانوں یا قصّوں کے اشارے بھی آگئے ہیں جو خاص ملکِ فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً بجائے عورت کے لڑکوں کا عشق۔ ان کے خط کی تعریف۔ شمشاد، نرگس، سنبل، بنفشہ، موے کمر۔ قد سرو وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلیٰ، شیریں، شمع، گل، سرو وغیرہ کا حُسن۔ مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق۔ فانوس کا برقع۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوری۔ رستم و اسفندیار کی بہادری۔ زحل کی نحوست۔ سہیل یمن کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصّے۔ راہ ہفتخواں۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوے شیر۔ قصر شیریں۔ جیحوں سیحوں وغیرہ وغیرہ۔ ہر چند یہ سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اردو میں بہت سے خیالات انہی کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں۔

تعجب یہ ہے کہ ان خیالوں نے اور وہاں تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ ان کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں انہیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا اور سید انشا کے کلام میں کہیں کہیں ہیں۔ اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف دیتی ہیں غرض اب ہماری انشا پردازی ایک پُرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صد ہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہیں۔

ہمارے متاخرین کو نئی آفریں لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کبھی
صفت بعد صفت۔ کبھی استعارہ در استعارہ سے اسے اور تنگ و تاریک
کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی
لطافت پیدا ہو گئی کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہیئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ
بجائے اس کے کہ کلام ان کا خاص و عام کے دلوں پہ تاثیر کرے۔ وہ مستعد
لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمیٰ اور عوام کے لئے ایک عجیب
گورکھ دھندا طلسمات ہو گیا۔ اور جواب ان کا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے جو نہ سمجھے
وہ اپنی جہالت کے حوالے۔

اب اس کے مقابلہ میں دیکھو۔ بھاشا کا انشا پرداز برسات میں اپنا
باغ کیونکر لگاتا ہے۔ درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھنے پتے ہیں
ان کی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں کھچڑی
ہو رہی ہیں کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی
بیل ککر کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔ عشق پیچہ گل زندہ پر چڑھا جاتا ہے
اس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں۔ جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے
پڑے جھوم رہے ہیں۔ مہوے کے ڈالے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں
کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے بور میں اس کے پھولوں
کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بو جی کو بھاتی ہے جب درختوں کی ٹہنیاں

ہلتی ہیں۔ مولسری کے پھولوں کا بچھونا بچھتا ہے۔ پھول پھلواری کی بوچھاڑ
ہوتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا ان کی بو باس میں بسی ہوئی روشوں پر چلتی ہے
ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹکھیلیاں کرتی چلی جاتی
ہے۔ کسی ٹہنی پر بھونرے کی آواز کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی
سماں باندھ رہی ہے۔ پرند درختوں پر بول رہے ہیں۔ اور کلول کر رہے ہیں۔
حوض میں چادر اس زور سے گرتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی
اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہرا جاتا ہے تو عجیب بہار
دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اترتے ہیں۔ نہاتے جاتے ہیں آپس میں
لڑتے جاتے ہیں۔ پروں کو پھڑاتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ چرند زمین پر
چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک۔ ایک طرف
سے کوکلے کی آواز۔ اسی جمگھٹ میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا
جی بہلا رہا ہے۔ اور اپنی جدائی کے دکھ کو مزے سے لے کر اٹھاتا ہے۔

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ سامنے گھٹا جھوم کر
اٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں
سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں۔ جب
بادل کڑکتا ہے۔ اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے کبھی دبک کر ٹہنیوں میں
چھپ جاتے ہیں کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جھنکار رہے ہیں

پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چنبیلی کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے پار، مقام پر پہنچا۔ دیکھتا ہے کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں۔ گرد سر سبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہ رہا ہے۔ جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔ اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کے پیڑ بوٹوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دودھیلی گایوں اور بکریوں کا چارہ ہو جائے۔

جب اداسی اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر جنگل سنسان۔ اندھیر بیابان۔ مرگھٹ میں دور دور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے بھوتوں پریتوں کی ڈراونی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد لال لال دیدے پھاڑے، لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے کوئی ایک کالا ناگ ککڑی کی طرح کھڑا چبا رہا ہے۔ بیچ بیچ غل ہوتا چلا آتا ہے

کہ لیجیو لیجیو۔ ماریو ماریو۔ جانے نہ پائے۔ دم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہوتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سنسان ہے۔ پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا۔ پانی کا شور۔ الو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتوں کا رونا یہ ایسی وحشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔

دیکھو یہ دونوں باغ آمنے سامنے لگے ہیں۔ تم نے مقابلہ کیا؟ دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے؟ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے۔ یا جن خوشبویوں کو سونگھتا ہے انہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف۔ بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا اکڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں۔ اور دہانِ غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔ ان مضامین کو دیکھ کر اول یہیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے کہ ہر ملک کی انشا پردازی۔ اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال تصویر بلکہ رسم رواج اور لوگوں کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے

کہ جو کچھ شاعر یا انشا پردازن کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہی اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران ۔ خراسان ۔ اور توران کی زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں ذوق وشوق پیدا کرتا ہے وہاں بہار میں بلبل ہزار داستان ہے یہاں کوئل اور پپیہا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اس کی کیفیتیں بھی خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات ہماری فصل بہار ہے۔ اور کوئل یہاں کی بلبل ہے۔ اس موسم میں عجیب لطف سے بولتی ہے۔ اور مستیاں کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے تو بسنت رت کا سماہے جس میں ہولی کے رنگ اڑتے ہیں پچکاریاں چھٹتی ہیں۔ گلال کے قمقمے چلتے ہیں۔ وہ باتیں نہیں جو فارسی والے بہار کے سمے پر کرتے ہیں۔

۶۔ دیباچہ مسدس

(خواجہ الطاف حسین حالی)

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ حالی انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تھے۔ اِن کے مورث خواجہ ملک علی تھے جو اپنے عہد میں اپنے تبحر علمی کے لئے مشہور تھے۔ حالی کی زندگی کے حالات دلچسپ اور سبق آموز ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ حقیقی علم دوست کن کن حالات میں کسب علم کر سکتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب ملا اور ۱۹۱۴ء میں بہ عمر ۷۷ سال انتقال فرمایا۔

حالی کو خدا نے ایک پاک اور حساس دل مرحمت کیا تھا اور فطرت نے شاعری کا ذوق سلیم مگر ان دونوں کی تربیت غالب۔ سرسید۔ اور شیفتہ جیسے ارباب بصیرت کی صحبت میں ہوئی اس کے علاوہ حالی انگریزی شاعری کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اردو میں اس قسم کی شاعری کی ابتدا کریں گے۔ پھر یہ کہ آزاد کی مثال پیش نظر تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے رنگ کی شاعری شروع کر دی اور اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ مجددین میں شمار ہوئے۔ آسمان شاعری کے آفتاب بن چکے اور اردو میں وہ صلاحیت پیدا کر دی جس کی یہ زبان صدیوں سے محتاج تھی۔

جہاں تک شعر کا تعلق ہے وہاں تک تو خیر حالی کی ہستی مسلماً نہایت بلند پایہ

ہے ہی، مگر دبنائے نثر میں بھی ان کی ذات کسی بڑے سے بڑے سے کم نہیں۔ حالی کی نثر صاف سادہ، سلیس با محاورہ اور موثر ہے۔ مگر ان کے یہاں آزاد کا سا چٹپٹا پن یا نذیر احمد کی سی نازک ظرافت نہیں۔ حالی کسی رنگ یا اسلوب کے مالک نہ تھے انکی تصانیف اپنے طرز تحریر کے لئے نہیں بلکہ اپنے مواد کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا نصب العین ہی یہ تھا کہ مصنف کو اپنے موضوع کا بہ نسبت اپنے انداز تحریر کے زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔ ان کے یہاں صنائع بدائع سے کام نہیں لیا جاتا ہے اور اگر لیا بھی جاتا ہے تو وہ کبھی اصل مقصود پر غالب نہیں آسکتے۔ ان کے یہاں نہ تخیل کا طلسم ہوتا ہے نہ لفظوں کا استعمال محض لفظوں کی خاطر۔ جو کچھ کہنا مقصود ہوتا ہے وہ مغلق و مبہم بنا کر نہیں بلکہ بہت زیادہ سلجھا کر اور قابل فہم بنا کر آسان سے آسان لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ لفظوں کی نمائش اور کثرت سے حالی کو چڑ ہے اور وہ عمداً بلکہ بڑی کوشش کے ساتھ تحریر کی لفظی بناؤٹوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ اسی صفائی اور سلاست کی برکت ہے کہ ان کا مطلب کبھی خبط نہیں ہونے پاتا اور جو نتیجہ اُن کے ذہن میں ہوتا ہے وہ ہی پیدا ہو کر رہتا ہے۔ فصاحت و تاثیر کے اعتبار سے حالی کی نثر قسم اول کی نثروں میں شامل کی جاسکتی ہے۔ اُردو کے عہد جدید اور نشاۃ الثانیہ کے انشاپردازوں میں حالی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اور سادہ نگاری کا جو اسوۂ حسنہ، غالب اور سرسید نے قایم کیا تھا۔ اس پر نہایت وفاداری کے ساتھ گام زن رہنے کا انہیں فخر حاصل ہے

تصانیف نثر۔

حیات جاوید، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات سعدی۔ تریاق مسموم،

مجلس النسار، مضامین حالی۔

ذیل کا مضمون مسدس کا دیباچہ ہے۔ جو اپنے موضوع اور طرز انشا دونوں کے اعتبار سے نہایت دلکش ہے،

رباعی

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہمکو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دلچسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خار دار جھاڑیاں تھیں۔ نہ آندھیوں کے طوفان تھے نہ باد سموم کی لپٹ تھی جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دلفریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں مگر یہ صحرا جسقدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سر سبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوشنما پودوں پر سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جو ہیں اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا۔ اور نہ عشق و جوانی کی

ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا۔ کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جاذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام کیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے گویا زندگی ایک پیرہن تھا جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانۂ خمار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی اور کبھی مے فروش کے گھر پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے ایمان سے بیزار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ برہمنوں کے چیلے بنے۔ بت پوجے زنار باندھا قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں۔ واعظوں کا خاکہ اڑایا۔ ویرانۂ بتخانہ کی

تعظیم کی۔ کعبہ اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا۔ حسن یوسفی کو تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں۔ قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور یاد خوانوں کے منہ پھیر دیئے۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے۔ ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھلائے ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مدّاح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود   تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس ۲۰ برس کی عمر سے چالیسویں ۴۰ سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں۔

شکست رنگ شبابش ہنوز رعنائی

دران دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم

بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی ڈور گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بیکار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے۔ اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لئے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے بڑھتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اسکے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اسی کے ساتھ اُفتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ پیروں میں چھالے پڑے ہیں۔ دم چڑھ رہا ہے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں لیکن وہ اُلوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے نہ اُسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے۔ نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لئے۔ نہ یہ خبر ہے کہ کہاں جاتے ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں نہ طلب صادق ہے نہ قلب راسخ ہے نہ عزم ہے نہ استقلال ہے۔ نہ صدق ہے نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک

زبردست بات ہے کہ کھینچے لئے چلا جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں دیرینہ سال پیرے بروش بیک نگاہے

زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ سانجھیوں کی ہوس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرتا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے بخارات درونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیرخواہ نے جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پُرزور بات اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے اُسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے

روچو انساں لب بجنباں در دہن

در جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے

جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاصکر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لئے ابتک کسی نے نہیں لکھی اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔

در فیض است نشیں از کشائش نا امید نجا ۔ برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ

ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے

نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انہیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہوا۔ مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی تاآنکہ الحمدللہ کہ بہت سی وقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق طیار ہو گئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ ہونا پڑا۔ صرف ایک اُمید کے سہارے پر یہ راہ دور دراز طے کی گئی ہے۔ ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے۔

خبرم نیست کہ منزل گہِ مقصود کجاست

این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اُس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعۃً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لیجانا بیان کیا ہے۔ بعد اسکے انکے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کیلئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خط و خال

کو دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جانکاہ نظم میں جیسی کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ مگر شکر ہے کہ جس قدر ہو گیا اتنی بھی امید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس روکھی پھیکی سیدھی سادھی نظم کو پسند نہ کریں گے۔ کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آجکل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے۔ نہ مبالغہ کی چاٹ ہے، نہ تکلّف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں جس سے اہلِ وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں کہ لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔ گویا اہل دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کیلئے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو ان کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن ست و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

۷۔ تراجم

(شبلی نعمانی)

شبلی نعمانی اپنے عہد کے نہایت ممتاز ادیبوں میں سے تھے۔ شبلی کی فطرت ہمہ گیر تھی اور انہوں نے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مگر بہ حیثیت ایک مورخ، ادیب، فلسفی، نقاد اور مصلح کے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ شبلی ۱۸۵۷ء میں مضافات اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ شبلی نے ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ سے حاصل کی اور فارسی عربی کی بہت اچھی لیاقت پیدا کر لی۔ اس کے بعد مولانا فاروق چڑیا کوٹی کی شاگردی اختیار کی اور انکی صحبت سے شبلی کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انکے علاوہ شبلی نے اور بھی کئی استادوں سے اور مختلف مقامات پر کسب علم کیا۔ اور یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا۔ ۱۸۸۲ء میں اتفاقاً علی گڑھ آنا ہوا۔ یہاں سرسید سے ملاقات ہوئی اور کالج میں فارسی کی پروفیسری کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ یہاں کے دوران قیام میں شبلی نے سرسید و حالی کی صحبت نیز سرسید کے کتب خانہ سے بڑا استفادہ کیا۔ انکے علاوہ پروفیسر آرنلڈ سے بھی ملاقات کا موقع ملا جو مشرقی زبانوں اور تمدن کا بڑا مداح تھا۔ انکی صحبت میں شبلی نے مغربی تنقید کے اصول سیکھے اور مشرقی ادبیات کے نقائص اور کمزوریوں سے واقفیت حاصل کی۔

علیگڈھ میں شبلی کو اسلامی کارنامے قلم بند کرنے کا شوق پیدا ہوا اور سرسید نے انکی ہمت افزائی کی۔ سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں شبلی نے کالج سے علیحدگی اختیار کی اور اعظم گڈھ واپس آئے۔ اس کے بعد چار سال حیدرآباد دکن میں سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی۔ یہ زمانہ سررشتہ تعلیم کی اصلاح۔ تصنیف و تالیف اور علمی و ادبی تحقیق میں بسر کیا۔ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما قائم ہوا اور اس کے قیام و انتظام میں بھی شبلی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۱۳ء میں شبلی نے بمقام اعظم گڈھ دارالمصنفین قایم کیا اور اپنا مکان۔ باغ۔ اور کتب خانہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے شبلی کو تمغۂ مجیدیہ عطا فرمایا اور اسی سال سرکار برطانیہ نے انھیں شمس العلما کا خطاب مرحمت کیا۔ شبلی الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو تھے اور ۱۹۱۱ء میں علوم مشرقی کی ترقی کے لئے جو کمیٹی سر ہارکورٹ بٹلر کی صدارت میں بمقام شملہ منعقد کی گئی یہ اُس کے بھی ممبر تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

شبلی کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی شوکت پارینہ کو زندہ کیا اور مسلمانوں کی تاریخ کی ایک بالکل نئے انداز پر بنیاد رکھی انھوں نے موضوع تاریخ کو ایک علم کی حیثیت سے تحقیق کی روشنی میں پیش کیا اور اس کام میں فن تنقید کے جدید اصولوں سے بہت کچھ مدد لی۔ چنانچہ ان کی ساری تاریخی تصنیفیں۔ ان کے تبحر علمی۔ مذاق سلیم تنقیدی نظر۔ غیر معمولی جفاکشی۔ اور ناقابل تحمل کی زندہ دلیلیں ہیں۔

ایک نقاد ادب کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت نہایت ممتاز ہے۔ چونکہ وہ خود شاعر تھے اس لئے شعر پر نقد کرنے کا ملکہ ان میں فطرتاً موجود تھا۔ ساتھ ہی

ساتھ اُن کی قوتِ فیصلہ اور مذاق نہ صرف درست و سلیم تھے بلکہ درجہ کے اعتبار سے بھی نہایت بلند تھے۔ چنانچہ شعرالعجم جو پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ان کی بے پایاں علمیت۔ وسعتِ مطالعہ اور تحقیق کی ایک غیر فانی یادگار ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ شبلی کے یہاں غلطیاں بھی ہیں۔ اور اُن کی تصنیفات میں نقائص برابر رونما ہوئے ہیں۔ مگر وہ نسبتاً بہت کم ہیں۔ اور ایک نقادِ فن کی حیثیت سے ان کے وقار میں کمی پیدا نہیں کرتے۔ شبلی نے مختصر مضامین بھی جنھیں انگریزی میں ایسے کہا جاتا ہے بہت لکھے ہیں۔ اور یہ مضامین ہمیشہ نہایت مسرت و دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے ہیں۔ یہ مضامین ادبِ لطیف کے ذیل میں سمجھے جاتے ہیں اور اپنی ادبی خوبیوں اور مصلحانہ اثرات کے اعتبار سے آپ اپنی مثال ہیں۔ شبلی کے خطوط بھی نہایت دلچسپ ہیں اور اُن سے بھی شبلی کے سوانح، تصانیف اور اس عہد کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی شاعر بھی تھے اور اس حیثیت سے بھی ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ مگر یہاں ان کی شاعری سے بحث نہیں ہے۔

شبلی کا اسلوبِ تحریر آمد۔ سادگی۔ سلاست اور فصاحت کے لئے مشہور خاص و عام ہے ان کے یہاں اغلاق و ابہام بالکل نہیں۔ بلکہ ان کے مضامین میں ایک ایسی صفائی اور درخشانی ہے جو اُن کے مفاہیم کو فوراً ذہن سے دوچار کر دیتی ہے۔ سرسید نے شبلی کی ان الفاظ کے ساتھ تعریف کی ہے کہ ان کا اسلوب تحریر فضلاء دہلی و لکھنؤ کے لئے باعثِ رشک ہے۔ شبلی کے یہاں مضمون الفاظ و استعارات کے سیاہ بادل میں چھپ کر

نہیں رہ جاتا بلکہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا رہتا ہے۔ ان کے الفاظ ہمیشہ موضوع
کی مناسبت سے اختیار کئے جاتے ہیں اور اس لئے قابل داد ہوتے ہیں۔ عاشقانِ
آزاد کو شبلی کی نثر ممکن ہے پھیکی اور بدمزہ معلوم ہوتی ہو مگر کاروباری نثر کی اس سے بہتر
مثال ملنا دشوار ہے۔ اور اس طرز کی ایجاد کو آخری صدی کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہئے۔

تصانیف۔ شعر العجم، سیرت النبی، الفاروق، الکلام، المامون، سیرت النعمان، مقالات
شبلی، مضامین عالمگیر، مکاتیب شبلی، موازنۂ انیس و دبیر، الغزالی، مولانا روم، سفرنامہ
روم و مصر و شام، علم الکلام، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، الجزیہ، حیات خسرو، تاریخ اسلام،
فلسفۂ اسلام و رسائل شبلی۔

ذیل کا مضمون رسائل شبلی کے ایک مضمون تراجم سے ماخوذ ہے۔

دولتِ عباسیہ کا پہلا تخت نشین سفاح تھا جس نے صرف دو ڈھائی برس
حکومت کی۔ پھر منصور مسند آرا ہوا اور دولت عباسیہ کا آغاز بھی اسی وقت سے
خیال کیا جاتا ہے۔ منصور خود بہت بڑا عالم اور صاحب فضل و کمال تھا۔ اسکی
حوصلہ افزائی نے علوم و فنون کا دریا بہا دیا۔ اس کا مبارک عہد تھا کہ اسلامی
علوم کی تدوین شروع ہوئی۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کو مدون کیا۔ ابن اسحٰق
نے غزوات نبوی لکھے۔ امام مالکؒ۔ اوزاعی رحؒ سفیان ثوریؒ وغیرہ نے
حدیثیں جمع کیں۔ منصور کا مذاق اتفاق سے عجمی واقع ہوا تھا۔ وہ ہر ہر بات
میں اہل عجم کی تقلید کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دربار کا لباس بھی عجمی رکھا۔ منصور ہی

پہلا شخص تھا جس نے عرب کے زور گھٹانے کے لئے عجمیوں کا رسوخ بڑھایا اور تمام بڑے بڑے عہدے اُن کے ہاتھوں میں دیدیے۔ اگرچہ منصور کی یہ کارروائی پولیٹیکل حیثیت سے نہایت خراب تھی۔ لیکن اس غلطی سے اتنا فائدہ ہوا کہ عرب میں فلسفے کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور آج مسلمانوں میں عقلی علوم کا جو کچھ رواج ہے وہ اسی غلطی کی بدولت ہے منصور نے جن عجمیوں کو دربار میں رسوخ دیا وہ عموماً صاحب فضل وکمال تھے اور اس وجہ سے انہوں نے طب و فلسفہ کی نادر نادر کتابیں منصور کے لئے بہم پہنچائیں اور انکے ترجمے کئے۔ ان میں ایک عبداللہ بن المقفع تھا جس کی نسبت ہمارے علمائے عرب نے تسلیم کیا ہے کہ شروع اسلام سے آج تک عربی زبان میں ایسا فصیح و بلیغ مقرر اور صاحب قلم نہیں گذرا۔ چنانچہ اس کی کتاب یتیمیہ کو ملحدوں نے (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ وہ مجوسی تھا اسکی مادری زبان فارسی تھی اسلام قبول کرکے اس نے عربی زبان میں کمال پیدا کیا اور منصور نے اسکو دربار کا میر منشی مقرر کردیا۔ چونکہ وہ مختلف زبانوں کا ماہر اور اسکے ساتھ نہایت فصیح و بلیغ تھا۔ اس کے ترجمے نہایت اعلیٰ درجہ کے خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ اب بھی یادگار ہے اور چھپ کر شایع ہو چکا ہے۔ اس نے یونانی زبان کی کتابیں بھی ترجمہ کیں۔ مثلاً قاطیفوراس باریمناس۔ انالوطیقا وغیرہ۔ فرفوریوس مصری کی کتاب ایساغوجی

کا ترجمہ بھی اسی نے کیا۔ فارسی زبان اس کی مادری زبان تھی اس لئے اس زبان کی کتابیں کثرت سے ترجمہ کیں۔ ان میں خدائی نامہ آئین نامہ یزدک نامہ نوشیرواں نامہ۔ جو تاریخ کی نادر کتابیں ہیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ بارسیوں کے علم الاخلاق کی دو بڑی کتابیں جو اس نے ترجمہ کیں وہ الادب الکبیر اور الادب الصغیر کے نام سے مشہور ہیں۔ چنانچہ ان کتابوں کا ذکر علامہ بن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے۔

اہل عجم میں سے ایک اور بڑا صاحب اثر شخص جو منصور کے دربار میں تھا نوبخت نام ایک آتش پرست تھا۔ وہ منصور کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا اور دربار میں اسکو وہ جاہ و افتخار حاصل تھا کہ اکابر دولت میں گنا جاتا تھا۔ اسکا خاندان ایک مدت تک علم و فضل کا سرپرست رہا اور ان کی وجہ سے فارسی زبان کے بہت سے ذخیرے عربی میں آئے۔ ابو سہل اور حسن بن موسیٰ جو بڑے پایہ کے متکلم تھے اور حسن کے ہاں مترجمین کا جمگھٹا رہتا تھا اسی نوبخت کے خاندان سے تھے۔ ان ہی عجمیوں میں سے جارج ابن جبرئیل بھی تھا جو مشہور مترجم گزرا ہے۔ یہ جندی سابور میں افسر الاطباء کے منصب پر ممتاز تھا۔ ۱۴۸ھ میں منصور نے اس کو علاج کے لئے طلب کیا اور پھر اس کا تمام خاندان دربار میں داخل ہو گیا منصور نے اس کی یہ قدر دانی کی کہ باوجود اس کے کہ اس نے اپنے مذہب

کو بہیں بلا تھا دربار کا طبیب مقرر کیا اور جب مرض الموت کی بیماری میں اس نے وطن کو واپس جانا چاہا تو سفر خرچ کے لئے پچاس ہزار روپئے عنایت کئے۔ جارج پہلا شخص ہے جس نے دولت عباسیہ میں طب کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کیں۔ اس کی کوشش سے طب کا بڑا ذخیرہ عربی زبان میں فراہم ہوا۔ اس نے خود بھی ایک نہایت مفصل اور عمدہ تجربات کی کتاب سریانی زبان میں لکھی جس کا ترجمہ حسنین بن اسحاق نے عربی میں کیا۔ منصور کے عہد سے لیکر سنہ ۴۵۰ھ تک یہ خاندان قائم رہا اور دولت عباسیہ کے اخیر عہد ترقی تک یہ خاندان برابر علوم طبیہ کا سرپرست، علم و فضل کا حامی اور دربار کا زیب و زینت رہا۔

طب کی کتابوں کا ایک اور مشہور مترجم جو منصور کے دربار میں تھا بطریق نام ایک عیسائی تھا۔ اس نے منصور کے حکم سے یونان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کے جو ترجمے اس نے کئے ساتویں صدی ہجری تک متداول رہے۔

منصور کے ذوق علمی کا یہ حال تھا کہ یونان کے علوم و فنون کا جو سرمایہ خود اس کے ملک میں بہم پہنچ سکتا تھا اس پر اکتفا نہ کر کے قیصر روم کو خط لکھا چنانچہ اس کی درخواست کے موافق قیصر نے فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منصور کے پاس روانہ کیں۔

منصور کے ذوق کا یہاں تک چرچا پھیلا کہ دور دراز ملکوں سے ہر قوم و

ست کے اہل کمال نے اس کے دربار کا رخ کیا۔ سنہ ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا
ایک بڑا ریاضی داں عالم بغداد میں آیا اور سنسکرت کی مشہور زیچ جس کا نام
سدھانتا ہے اور جس کے متعلق آگے چل کر ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھیں
گے منصور کی خدمت میں پیش کی محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے
اس کا ترجمہ کیا۔ مامون الرشید کے زمانہ تک اعمال کواکب اسی زیچ پر
اعتماد کیا جاتا تھا۔

مذہب کی تحقیقات کے لئے منصور نے اجازت دی کہ تمام مختلف فرقوں
کی مذہبی کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ اس وقت ایران میں جس مذہب کا بہت
چرچا تھا۔ وہ مانی کا مذہب تھا مانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور چند کتابیں پیش
کی تھیں کہ خدا کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہیں بادشاہ وقت نے اسکو قتل کرا دیا
اور حکم دیا کہ اس کے پیروؤں میں سے ایک متنفس بھی زندہ نہ رہنے پائے۔ چنانچہ
عجم کی اخیر سلطنت تک اس فرقہ والے ادھر اُدھر مارے مارے پھرے لیکن
جب اسلام کا زمانہ آیا تو اس نے تمام مذاہب کو آزادی دی۔ اس وقت یہ فرقہ
بھی عراق کو واپس آیا چونکہ خالد ابن عبداللہ قسری گورنر عراق نے ان پر خاص توجہ
کی وہ امن و اطمینان کے ساتھ اپنے مذہب کی ترویج میں مصروف ہو گیا۔ یہ کا
عہد آیا تو مانی کی تمام تصنیفات ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ عبداللہ بن المقفع اور
مترجموں نے ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ مانی کے سوا مجوسیوں کے اور

بانیان مذاہب مثلاً دیسان مرقوں کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کو دوسری قوں کے مذہب اور مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل ہوئی اگرچہ اول اول اس کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں میں اعتدال سے زیادہ مذہبیت آگئی اور بعض لوگ الحاد کی طرف مائل ہوگئے۔ یہاں تک کہ ابن ابی العرجار حماد عجرد یحیی ابن زیاد مطیع بن ایاس نے مانی وغیرہ کی تائید میں کتابیں لکھیں تاہم منصور نے آزادی کے لحاظ سے کچھ روک نہیں کی اور سچ پوچھو تو اس سے بڑا نفع یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک نیا علم جو علم کلام کہلاتا ہے پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے الحاد اور زندقہ کا راستہ رک گیا۔

اسکی ابتدا یوں ہوئی کہ مانی وغیرہ کی کتابوں کے پھیلنے سے جب الحاد کی ہوا چلی تو منصور کے فرزند خلیفہ مہدی نے اپنے عہد حکومت میں اس آگ کو آب تیغ سے بجھانا چاہا۔ چنانچہ ہزاروں اور سیکڑوں آدمی قتل کرا دیے۔ لیکن خیالات کی آزادی جبر و تعدی سے رک نہیں سکتی تھی آخر اس نے علمائے اسلام کو حکم دیا کہ ملحدوں کے رد میں کتابیں لکھیں۔ اس طرح علم کلام کی بنیاد پڑی۔ ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ مخالفوں کے مذہب اور خیالات کے رد کرنیکے لئے ان کی مذہبی تصنیفات سے زیادہ واقفیت حاصل کرنیکی ضرورت پیش آئی۔ اور اس وجہ سے خواہ مخواہ غیر زبانوں کے سیکھنے اور ترجمہ کرنے کا زیادہ تر رواج ہوا۔

مہدی کے بعد جب ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا تو اُس وقت تک یونانی، فارسی، سریانی، ہندی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ ہارون الرشید نے ان کو منتظم صورت میں رکھنے کے لئے ایک عظیم الشان محکمہ قائم کیا جس کا نام بیت الحکمہ رکھا۔ اور ان میں ہر زبان اور ہر مذہب کے ماہرین فن ترجمہ کے کام پر مامور کئے ان میں فضل بن نوبخت مجوسی بھی تھا اور وہ خاص فارسی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھا۔ رشید کے دور میں فلسفہ کا بڑا سرمایہ ایک خاص وجہ سے ہاتھ آیا۔ شاہان روم کا معمول تھا کہ خلافت عباسیہ کو سالانہ نذرانہ بھیجا کرتے تھے۔ نایس فورس جو رشید کے عہد میں روم کے تخت سلطنت پر بیٹھا اس نے نذرانہ بھیجنے سے انکار کیا۔ اور رشید کو گستاخانہ خط لکھا۔ اس کے انتقام میں رشید نے ایشیائے کوچک پر جو اس وقت رومیوں کا پایہ تخت تھا پے در پے حملے کئے اور دارالسلطنت ہرقلہ کو برباد کر دیا۔ یونان کے بعد یونانی فلسفے کی تعلم و تعلیم انہی ممالک میں منتقل ہو کر آ گئی تھی۔ چنانچہ رشید نے انگوریہ اور اموریہ وغیرہ کو فتح کیا تو بیشمار یونانی کتابیں ہاتھ آئیں۔ رشید نے ان کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔ اور اس زمانہ کے مشہور مترجم کو جس کا نام یوحنا بن ماسویہ تھا ان کے ترجمہ پر مامور کیا۔ یہ تمام کتابیں خزانۃ الحکمۃ میں داخل کی گئیں اور یوحنا خزانۃ الحکمۃ کا افسر مقرر کیا گیا۔

سنسکرت کی علمی تصنیفات اگرچہ منصور کے عہد میں بغداد پہنچ چکی تھیں لیکن اس

زمانہ میں اور نئے سامان پیدا ہوگئے۔ ہارون الرشید ایک دفعہ سخت بیمار ہوا اور گو بغداد طبیبوں سے معمور تھا تاہم اس کو کسی کے علاج سے شفا نہیں ہوئی۔ اس وقت ہندوستان کا ایک طبیب فلاسفر بھی شہرت عام رکھتا تھا۔ اور چونکہ دربار خلافت اور فرمانروایان ہندوستان سے دوستانہ مراسم قائم تھے اور باہم خط و کتابت رکھتے تھے۔ سب نے اس کو بلانے کی رائے دی۔ غرض وہ طبیب طلب کیا گیا۔ اور بغداد میں برامکہ کا جو ہسپتال تھا اس کا مہتمم اور افسر مقرر کیا گیا۔ سنسکرت کی اکثر کتابیں اس نے ترجمہ کرائیں۔ چنانچہ ششترت کی کتاب جو دس بابوں میں ہے اور سابیکا جس میں زہروں کے علاج کا بیان ہے اس نے ترجمہ کی۔

رشید کے دربار میں اور بھی ہندو طبیب تھے جن کی وجہ سے ویدک کی معلومات عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔ ان میں صالح (اصلی نام سالی ہوگا) کا حال علامہ ابن ابی اصیبعہ نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

۸۔ نصوح اور سمجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

(نذیر احمد)

نذیر احمد موضع راہر ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد کا نام سید سعادت علی تھا اور چونکہ ان کے خاندان میں علم موروثی تھا اس لئے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور کے آگے زانوے ادب تہ کیا مگر ۱۸۴۵ء میں دہلی چلے گئے اور وہاں مولوی عبدالخالق کی شاگردی اختیار کی اور پھر انہی کی پوتی سے شادی ہوئی۔ دہلی کالج میں مولوی مملوک علی پروفیسر عربی کی موجودگی نے نذیر احمد کے دل میں کالج کے داخلہ کا شوق پیدا کیا مگر ان کا داخلہ مشکل ہو سکا۔ نذیر احمد نے یہاں عربی ادبیات، فلسفہ، اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ آزاد، کریم الدین، ذکاء اللہ اور آشوب ان کے ہمعصر تھے۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر نے نذیر احمد کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی۔ مگر انکے والد اس قدر انگریزی کے خلاف تھے کہ انہیں آخر کار یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ اسکے پہلے نذیر احمد بیس، پچیس روپیہ ماہوار پر پنجاب میں مدرس مقرر ہوئے۔ اسکے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انہوں نے ایک انگریزی لیڈی کی جان بچائی جسکے صلہ میں انہیں ایک تمغہ اور کچھ نقد روپیہ عطا ہوا اور انسپکٹر مدارس کر دیئے گئے اور الہ آباد کو تبادلہ ہوا۔ یہاں انہیں انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا کیونکہ صرف زبان انگریزی

حکام اور ہندوستانیوں کے درمیان ربط اتحاد قایم کرنے کا وسیلہ تھی۔ چھ مہینے کے اندر انہوں نے اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں انہیں تعزیرات ہند ترجمہ کرنے پر مامور کیا گیا۔ انکا یہ کام اس قدر پسند ہوا کہ انہیں پہلے تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر بندوبست کر دیا گیا۔ اور اسکے بعد ضلع میں تعیناتی ہوئی۔ اب نذیر احمد کی سر سالار جنگ حیدرآباد کے مشہور وزیر اعظم سے ملاقات ہوگئی۔ اور انہوں نے انکی خدمات حیدرآباد کے لئے منتقل کرا لیں۔ یہاں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور آخرکار سرکاری ملازمت کو مستعفی ہو کر مستقلاً حیدرآباد کی ملازمت اختیار کر لی اور وہاں اس قدر ترقی کی کہ بورڈ آف ریوینیو کے ممبر کی حیثیت سے ۱۷ سو تک تنخواہ پائی۔ حیدرآباد سے پنشن لینے کے بعد مولوی نذیر احمد نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور بقیہ زندگی مذہب و ادبیات کی خدمت میں بسر کر کے سنہ ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب ملا۔ اور سنہ ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونیورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی اور سنہ ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری مرحمت کی۔ ان کا اسلوب تحریر صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ مگر آخر زمانہ کی تحریروں میں علمی شان ذرا زیادہ ہے۔ فارسی مثالوں اور عربی الفاظ و فقرات کا جا بجا استعمال کیا گیا ہے۔ مگر کہیں کہیں بالکل بیجا ہے۔ اس سے عبارت میں ایک قسم کی کرختگی اور بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ انکی عبارت میں آزاد کی سی شیرینی اور چٹپٹا پن نہیں۔ کہیں کہیں وہ تشبیہات سے بھی کام لیتے ہیں مگر یہ بے محل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کو بھی بے ضرورت استعمال کر بیٹھتے ہیں۔ جس سے عبارت کے حسن و شوکت

میں بہت فرق آجاتا ہے۔ ان کی تحریر کی خصوصیت ایک قسم کی ظرافت ہے جو انکے ناولوں خطبوں، حتیٰ کہ دقیق مضامین میں بھی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ ظرافت بیجا اور نامحدود نہیں بلکہ نہایت پاکیزہ اور مناسب طریقوں پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے معاصرین میں نذیر احمد سب سے زیادہ اثر رکھتے تھے اور یہی ان کا تمغائے امتیاز ہے۔ سرسید کاروباری اردو کے موجد تھے۔ حالی نے مغربی اصول پر تذکرے اور تبصرے لکھے۔ آزاد نے ادب لطیف پیش کیا اور شبلی نے تاریخی تحقیقیں کیں۔ مگر ان میں سے کوئی نذیر احمد کی برابر مقبول نہ ہوا۔ تعزیرات ہند اور دوسرے ایکٹ ترجمہ کرنے کی وجہ سے عوام ان کے نام سے واقف ہو گئے۔ قرآن مجید کے ترجمے نے ہندوستانی مسلمانوں کو اُن کے نام سے آگاہ کر دیا۔ تعلیم نسواں کے متعلق نہایت دلچسپ اور سبق آموز کتابیں لکھنے سے ان کا نام ہندو اور مسلمان خاندانوں میں ہر لڑکی، لڑکے اور ماں کے زبان زد ہو گیا۔ اسی طرح اُنکے خطبوں اور تقریروں نے انہیں بہت مشہور کر دیا اور ان کے تعریف کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے کے ادیبوں میں نذیر احمد کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے قلم سے ادب اردو کی عظیم الشان خدمت کی اور تعلیم، ترقی نسواں اور عام مسلمانوں کے بہبود کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔

تصانیف مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ، فسانۂ مبتلا، مصائب غدر، موعظۂ حسنہ، صرف صغیر، نصاب خسرو، رسم الخط، چند پند، حکایات، مبادی الحکمت، الحقوق و الفرائض،

اجتہاد، مجموعہ نظم بے نظیر، ترجمۃ القرآن، ادعیۃ القرآن، اتمام حجت، امہات المسلمین
مطالب قرآن، ما یغنیک فی الصرف، مجموعہ لکچر تنبیہہ، اور تعزیرات ہند وغیرہ۔

یہ مضمون توبۃ النصوح سے ماخوذ ہے۔

نصوح نے نماز عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پچھوایا کہ دیکھو مدرسہ سے آئے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابھی آئے ہیں اور کپڑے اتار رہے ہیں تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا میرے پاس ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں علیم مدرسے کا لباس اتار کتابیں ٹھکانے سے رکھ باپ کی خدمت میں جا حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی باپ نے کہا آؤ صاحب آج کل تو میں نے سنا ہے تم کو بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے **بیٹا** امتحان ششماہی قریب ہے اسی کے واسطے کچھ تیاری کر رہا ہوں۔ دن تھوڑے سے رہ گئے اور کتابیں بہت سی دیکھنے کو باقی ہیں۔ ہر چند ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو گھر پر کتاب دیکھا کروں مگر بن نہیں پڑتا۔ لوگ جو بھائی جان کے پاس آکر بیٹھتے ہیں ایسی دھوم مچاتے ہیں کہ طبیعت اچاٹ ہوئی چلی جاتی ہے **باپ**۔ پھر تم کچھ اس کا انسداد نہیں کرتے۔ **بیٹا** اسکا انسداد میرے اختیار سے خارج ہے اور رات رائیگاں جاتی ہے۔ دن کو البتہ میں نے مکان کا رہنا ہی چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی اور اپنے کسی ہم جماعت کے یہاں چلا گیا۔ **باپ**۔ اور بڑے امتحان کے واسطے بھی کچھ تم طیاری کر رہے ہو۔ **بیٹا** ابھی اس کے بہت دن پڑے ہیں اس سے فارغ ہو کر دیکھا جائیگا **باپ**۔ کہا اسکا کوئی وقت مقرر ہے **بیٹا**۔ جی ہاں بڑے دن کی تعطیل کے قریب ہوا کرتا ہے۔ **باپ** نہیں نہیں تم نے بڑی

مراد کو نہیں سمجھا۔ میں حساب آخرت کو بڑا امتحان کہتا ہوں۔ کیا وہ بڑا امتحان نہیں ہے۔ علیم باپ کا منہ دیکھنے لگا۔ تو پھر باپ نے کہا کیا تم حساب آخرت کو بڑا امتحان نہیں سمجھتے یا تم کو اس میں کچھ کلام ہے۔ علیم۔ سچ پوچھئے تو سب سے بڑا سخت امتحان وہی ہے۔ باپ۔ تو جب میں تمہارے ان دنیاوی چھوٹے چھوٹے امتحانوں کی خبر رکھتا ہوں تو کیا اس بڑے سخت امتحان کی نسبت میں نے تم سے پوچھا تو کچھ بیجا کیا۔ بیٹا۔ جناب میں تو نہیں کہتا کہ آپ نے بیجا کیا۔ ایسا کہنا میرے نزدیک گستاخی اور گناہ دونوں ہے۔ باپ۔ اچھا تو میں سننا چاہتا ہوں کہ تم اس بڑے سخت امتحان کے واسطے کیا طیاری کر رہے ہو۔ بیٹا۔ جناب سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس امتحان کے واسطے کچھ تیاری نہیں کی۔ باپ۔ کیا یہ غفلت نہیں بیٹا۔ جناب غفلت بھی پرلے درجہ کی غفلت ہے۔ باپ۔ لیکن جب تم ایسے دانشمند ہو کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لئے مہینوں اور برسوں پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اس سخت امتحان سے غافل رہنا بڑے تعجب کی بات ہے۔ بیٹا۔ شامتِ نفس۔ باپ۔ لیکن تمہاری غفلت کا کچھ اور بھی سبب ضرور ہوگا بیٹا۔ سبب یہی ہے میری سہل انگاری۔ باپ۔ تم جواب دیتے ہو لیکن صرف لفظوں کو پھیر پھار کر۔ میں تم سے غفلت کا سبب پوچھتا ہوں اور تم نے کہا کہ سہل انگاری اور سہل انگاری اور غفلت ایک چیز ہے۔ تو گویا تم نے غفلت کو غفلت کا سبب کہا۔ بیٹا۔ شاید گھر میں دین داری کا چرچا نہ ہونے سے میری غفلت کو

ترقی ہوئی ہو۔ باپ۔ یہی بیشک یہی سبب ہے تمہاری غفلت کا اور میں نے تم سے
کھود کھود کر اس لئے دریافت کیا کہ جہانتک تمہاری غفلت میری بے پروائی کی
وجہ سے ہے اس کا الزام مجھ پر ہے اور ضرور ہے کہ میں تمہارے روبرو اس کا
اقرار کروں اور تم چھوٹے ہو کر مجھ کو ملامت کرو۔ بیٹا۔ نہیں جناب قصور سراسر میرا ہے
مجھ کو خدا نے اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی عقل وہی نہ تھی کہ مجھ کو ایک دن مرنا ہے
اور میرے پیدا کرنے سے صرف یہی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں جانوروں کی
طرح کھانے اور پانی سے اپنا پیٹ بھر کر سو رہا کروں۔ باپ۔ تمہاری باتوں سے ظاہر
ہوتا ہے کہ تمہاری دینی معلومات بھی کم درجہ کی نہیں ہے لیکن نہ تو دین کے مسائل میں نے
تم کو سکھائے نہ انکے سیکھنے کی کبھی تاکید کی۔ مدرسہ میں تاریخ و جغرافیہ و ہندسہ و ریاضی
کے سوا دوسری چیز پڑھاتے نہیں پھر تم نے دینی معلومات حاصل کی تو
کہاں سے کی بیٹا اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا
لیکن وہ دوسرے ملک کی زبان میں ہے طوطے کی طرح اول سے آخر تک پڑھ گیا
مطلق سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کیا اس کا مطلب ہے۔ پھر مکتب میں گیا
تو وہاں بھی کوئی دین کی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ قصے کہانی ان میں بھی اکثر
بری بری باتیں۔ یہاں تک کہ جن دنوں میں ہمارا وانش پڑھتا تھا ایک پادری صاحب
چاندنی چوک میں سر بازار وعظ کہا کرتے تھے مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا
ہو جاتا تھا پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا بھی ایک بڑا بھاری ذخیرہ رہتا تھا اور اکثر لوگوں
کو اس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے

انہوں نے کتاب کی جلد تو اُکھاڑلی اور ورق نوچ کر پھاڑ کر پھینک دیا یا پیچھے بتائے۔ کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھ کو بھی لالچ آیا اور میں نے کہا چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتاب مانگیں۔ مکتب سے اُٹھ میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا بہت سے لوگ ان کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں ہمارے مکتب کے بھی دو چار لڑکے تھے لوگ انکے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے اُس کو میں نے خوب نہیں سمجھا۔ مگر ایک بات تھی اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو مسلمان سینکڑوں آدمی ایک طرف۔ لوگ ان کو بہت سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا مگر پادری صاحب کی پیشانی پر چین بھی تو نہیں آتی تھی۔ سخت بات سنکر اُلٹے مسکرا دیتے تھے۔ لڑکے ایک شیطان ہوتے ہیں تھوڑی دیر تک تو کھڑے سنتے رہے چلنے لگے تو اُن میں سے ایک نے کہا تو تو ہے بے تو تو ہے۔ اس کی یہ بات سب لوگوں کو ناگوار ہوئی اور دو چار آدمیوں نے اس کو مارنے کے لئے تھپڑ بھی اُٹھائے۔ پادری صاحب نے روکا اور منع کیا کہ خبردار اس سے کچھ مت بولو۔ تو تو موتی کو بھی کہتے ہیں۔ شاید اس نے یہ سمجھ کر کہا تو اُس کو انعام دینا چاہیئے۔ پادری صاحب کی اس بات نے مجھ پر کیا شاید سب لوگوں کے دل پر بڑا اثر کیا اور جب شام ہوئی لوگ رخصت ہوئے تو کئی آدمی آپس میں کہتے جاتے تھے بھائی اس شخص کا عقیدہ چاہے کیسا ہی ہو لیکن حلم اور بردباری یہ صفت تو اس میں اولیاء اللہ کی سی ہے۔ غرض پادری صاحب

تو وعظ میں مصروف تھے اور میں اپنی تاک میں تھا کہ ذرا بھیڑ کم ہو یا پادری صاحب کا
سلسلۂ سخن منقطع ہو تو کتاب مانگوں۔ لیکن نہیں معلوم پادری صاحب کو میرے قیافے
سے یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں کچھ اُن سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی پوچھا کہ
صاحبزادے تم کچھ مجھ سے کہو گے۔ میں نے کہا کہ آپ سب لوگوں کو کتابیں
دیتے ہیں ایک کتاب مجھ کو بھی دیجئے۔ پادری صاحب بہت خوب اس
الماری میں سے تم ایک کتاب پسند کر لو۔ میں نے سنہری جلد کی ایک بڑی
موٹی سی کتاب چھانٹی تو پادری صاحب نے کہا کہ مجھ کو اس کے دینے میں تو کچھ
عذر نہیں۔ لیکن تم اس کو پڑھ بھی سکو گے؟ کون سی کتاب تم پڑھتے ہو۔ میں نے کہا
بہارِ دانش۔ پادری صاحب۔ بھلا تمہارا آج کا سبق میں بھی سنوں۔ میں نے جزدان
میں سے کتاب نکال پڑھنا شروع کیا۔ اُس دن کا سبق کمبخت ایسا فحش اور بیہودہ
تھا کہ لوگوں کے مجمع میں مجھ کو اُس کا پڑھنا دشوار تھا۔ بمشکل کوئی دو تین سطریں میں نے
پڑھی ہونگی کہ پادری صاحب نے فرمایا بیشک تم نے جو کتاب پسند کی ہے اسکو
بخوبی پڑھ سکو گے اور وہ کتاب میں تم کو خوشی سے دیتا ہوں لیکن میں افسوس کرتا
ہوں کہ کیوں میں نے تم کو ایسی کتاب کے پڑھنے کو کہا جس کے پڑھنے سے تم اور سننے
سے میں اور یہ سب صاحب جو کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کے گنہگار ہوئے۔ خدا
ہم سب کی خطا کو معاف کرے اور تم چاہے میری دوسری بات مانو یا نہ مانو لیکن
اس کتاب کو تو ضرور چھوڑ دو کہ اس کا مطلب تمہارے مذہب کے بھی بالکل خلاف ہے۔ میں تم سے

سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمہارے حق میں بہتر ہے۔ یہ کتاب جو تم
پڑھتے ہو تم کو گناہ اور برائی سکھاتی اور بد اخلاقی اور بیحیائی کی خراب راہ بتاتی ہے۔
باوجودیکہ لوگ پادری صاحب کی ہر ہر بات کو کاٹتے تھے مگر اس کو سب نے تسلیم کیا۔
پادری صاحب سے جو کتاب میں مانگ کر لایا اس کا نام تو مجھ کو نہیں معلوم مگر اس میں
اردو میں کسی خدا پرست اور پارسا آدمی کے حالات تھے اگرچہ فی الواقع میں اُس
کتاب کو جلد ہی کے لالچ سے لایا تھا مگر میں نے کہا کہ لاؤ دیکھوں تو اس میں لکھا
کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں میں اس کو پڑھتا جاتا تھا میرا دل
اُس میں لگتا تھا۔ اور اس کی باتیں مجھ کو بھلی معلوم ہوتی جاتی تھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے
سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز زندگی جانوروں سے بدتر ہے اور میں روئے زمین پر
بدترین مخلوقات ہوں اکثر اوقات مجھ کو اپنی حالت پر رونا آتا تھا اور گھر والوں کا وتیرہ
دیکھ دیکھ کر مجھ کو ایک وحشت ہوتی تھی۔ یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ مصیبت زدہ
لوگوں کو دیکھ کر ہنستا تھا یا اس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو اپنی
تکلیف سمجھنے لگا۔ مکتب اور بہار وانش دونوں کو تو میں نے اُسی دن سلام کیا تھا جس
روز کہ مجھ کو پادری صاحب نے نصیحت کی۔ گھر میں اکیلا پڑا ہوا دن بھر اُسی کتاب کو
دیکھا کرتا۔ مکتب کے لڑکے چند بار مجھ کو بلانے آئے مگر میں نہ گیا۔ آخر خود میاں جی
صاحب تشریف لائے اور میں نے جی مضبوط کرکے ان سے صاف کہہ دیا کہ
مجھ کو پڑھنا منظور نہیں۔ آپ ان دنوں دکھن ہی تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز

نصیبوں کی شامت میں نہیں معلوم کہاں چلا گیا میری غیبت میں وہ کتاب کہیں
بھائیجان کی نظر پڑ گئی اور شب برات کے کوئی چار یا پانچ دن باقی تھے بھائیجان کو پٹاخوں کیلئے
ردی درکار تھی بے تامل کتاب کو چیر پھاڑ برابر کر دیا۔ میں نے آکر دیکھا تو پھر سر پیٹا
کیا ہونا تھا دوڑا ہوا چوک گیا کہ پادری صاحب ہوں تو دوسرا نسخہ لاؤں۔ مگر معلوم
ہوا کہ صاحب آگرہ چلے گئے۔ میں کف افسوس ملکر رہ گیا۔ بھائی صاحب کے دوستوں سے
شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ میاں شکر کرو کہ وہ کتاب پھٹ گئی نہیں تم کرشان ہی ہو
ہوتے۔ یہ جواب سنکر مجھ کو ایک نئی حیرت پیدا ہوئی کہ اگر کرشان ایسے ہی لوگ ہوتے
ہیں جن کا حال میں نے اس کتاب میں پڑھا تو انکو برا سمجھنا کیا معنی۔ غرض یہ خیالات
تھے اسکے بعد تو میں مدرسے میں داخل ہوا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر آپکے نزدیک یہ
خیالات دین و مذہب سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں تو یہ صرف اس کتاب کا اثر ہے ورنہ دین کا کوئی
رسالہ کبھی مجھ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا یا پہلے اہل اسلام اور عیسائیوں کے معتقدات میں کچھ
اختلاف ہے مگر پھر بھی جس قدر عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہوا ہے اتنا کوئی دوسرا
مذہب نہیں ملتا۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور انکے بزرگان دین قسیسوں اور راہبوں کی
تعریف آئی ہے۔ عیسائیوں کی نرم دلی اور خاکساری کی مدح کی ہے۔ انکی انجیل کلام الٰہی ہے۔
عیسائیوں کے ساتھ مواکلت درست۔ مناکحت روا۔ غرض اس قدر مغایرت کہ اہل اسلام
عیسائیوں کے ساتھ برتتے ہیں میں اسکو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ اس ملک کے ہندوؤں کے اختلاط کا
اثر ہے۔ افسوس ہے ہم مسلمانوں پر کہ ایسا عمدہ اور پاکیزہ اور مکمل اور بدیہی مذہب رکھکر مطلقاً

اسکی قدر نہیں کرتے۔ پادریوں کا سا اہتمام تو کہاں نصیب ہوتا تھا۔ اتنی بھی توفیق
نہیں کہ اپنی اولاد کے تو دین و مذہب کی خبر لیں۔ اولاد تو اولاد مجھ سے اپنے ہی
مذہب کا ٹھکانا نہیں نام کے مسلمان اور عمل دیکھو تو بدتر از شیطان ہیں کسی دوسرے کو کیا
الزام دوں کہ میں آپ سب سے بدتر شکستہ ہوں۔ کیا یہ کچھ تھوڑی بات ہے کہ تمہاری
عمر اتنی ہونے آئی اور بہتیرا ہی کچھ لکھا پڑھا مگر دین کی ایک ہی کتاب تمہاری نظر سے
گذری وہ بھی عیسائیوں کی اور اتفاقیہ طور پر۔ خیر بہرکیف اس وقت جو ضرورت مجھکو
درپیش ہے یقین ہے کہ تمہارا اس کتاب کا دیکھ لینا بھی اس میں بہت کام آئے گا۔
ہمدردی کی جیسی کچھ تاکید ہے تم نے اس کتاب میں دیکھا ہوگا بیٹیا۔ اگر وہ مذہبی کتاب
تھی تو میں جانتا ہوں کہ خاکساری و ہمدردی شرط عیسائیت ہے۔ بابا یہ شرط
عیسائیت کیسی بلکہ شرط انسانیت ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ‏ ‏ ‏ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم اس فرض کی تعمیل کہاں تک کرتے ہو۔ بیٹیا۔ جناب
شاید اگر میں اس کو ہمدردی کہہ سکوں تو مدرسہ کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا
ہے میں اس میں مطلق دریغ نہیں کرتا گو میرا ذاتی حرج بھی ہوتا ہو۔ امتحان سالانہ میں
مجھ کو نقد روپیہ ملے تھے میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا محلے میں چند آدمی
رہتے ہیں جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں وقتاً فوقتاً انکو اس میں سے دیتا رہا۔ بلکہ ایک
مرتبہ میں ایک دقت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

۱۹۳-۸

(ذکاء اللہ)

مولوی ذکاء اللہ نے جو دہلی کالج کے ایک نہایت ممتاز طالب علم تھے، اپنی زندگی ہندوستانی طلبا کی تعلیم و تربیت کے لیئے وقف کر دی تھی۔ یہ سنہ ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا جو بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا کوچک سلطان کے اُستاد تھے۔ ذکاء اللہ بارہ سال کی عمر میں نذیر احمد اور آزاد کے ساتھ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ تینوں ہم جماعت تھے۔ اور انھوں نے زندگی بھر اپنی دوستی قائم رکھی اور سب کو سرکار نے شمس العلما کا خطاب مرحمت کیا۔ تعلیم ختم کرنیکے بعد، ذکاء اللہ اسی کالج میں ریاضی کے معلم مقرر ہو گئے۔ اسکے بعد آگرہ کالج میں اُردو اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور سات سال تک یہ کام انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کا عہدہ ملا اور بلند شہر و مراد آباد میں تعیناتی ہوئی۔ گیارہ سال تک اس عہدہ پر رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج دہلی کے پروفیسر منتخب ہوئے مگر چارج لینے سے قبل میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسری پر تقرر ہو گیا جہاں سب سے اونچے درجوں کو فارسی اور عربی پڑھانے کا کام سپرد ہوا۔ آخر کار ۳۲ سال کی ملازمت کے بعد پنشن لی اور ۲۴ سال تک پنشن لیتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں رحلت فرمائی۔

مولوی ذکاء اللہ کے ادبی مشاغل ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک جاری رہے۔ اور انکی

تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں۔ انکو لکھنے کا بڑا شوق تھا اور انہوں نے تعداد میں ۱۴۲ سے زیادہ تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ صحافت میں بھی ان کا بڑا درجہ ہے۔ اپنے عہد کے قریب قریب سارے اخبارات اور رسائل مثلاً رسالہ حسن، تہذیب الاخلاق، سائنٹفک گزٹ علی گڈھ، ادیب فیروز آباد، مخزن، زمانہ، خاتون، علی گڈھ منتھلی میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے سرکار نے بھی انکی خدمات کا اعتراف کیا اور تعلیم نسواں کی ترقی میں حصہ لینے کے صلہ میں انہیں خلعت عطا کیا۔ اس کے علاوہ انہیں پندرہ سو روپیہ نقد انعام ملا۔ اور خان بہادر شمس العلما کے معزز خطابات مرحمت کئے گئے ۔۔ ایک حامی تعلیم مورخ اور سرسید کے مددگار ہونے کی حیثیت سے مولوی ذکاء اللہ ایک منفرد ہستی کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں کوئی غیر معمولی ذہانت نہ تھی اور نہ انہوں نے کوئی ایسی تصنیف چھوڑی ہے جسے عالی دماغی کا ثمرہ کہا جاسکے۔ انکی خصوصیت صرف یہ ہے کہ یہ ہر موضوع پر لکھ سکتے تھے اور خوبی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ ان کا طرز تحریر سائنس اور ریاضی کے ترجموں کے لئے خاص طور پر موزوں تھا۔ ان کے اسلوب میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدگی اور ادبی شان موجود ہے جو انکی نثر کو خاص امتیاز بخشتی ہے۔ اگر ایک طرف انکی تحریر میں اثر قوت اور جدت فصاحت کے محاسن زیادتی کے ساتھ نہیں پائے جاتے تو دوسری طرف تصنع اور پیچیدگی بھی نہیں جو تحریر کے بڑے معائب سمجھے جاتے ہیں۔

تصانیف۔ تاریخ ہندوستان، تاریخ عہد انگلشیہ، آئین قیصری، کرزن نامہ، فلسفہ امثال، صحیفہ فطرت، تقویم اللسان، تعلیم الانتظام، اہل عرب کا جبر و مقابلہ، جغرافیہ

ریاضیہ، جغرافیہ طبعی، معاون الحساب، رسالۂ علم مساحت، مساحت ٹوڈ ہنٹر، محاربات عظیم
رسالۂ علم تناسب۔

ذیل کا مضمون رسالۂ ادیب فیروزآباد سے ماخوذ ہے۔

خدا نے اپنی دو صفتوں کے نمونے یا انکی نشانیاں ہوا کو عطا فرمائی ہیں۔
ایک ہمہ جا ہونے کی دوسری عیاں و نہاں ہونیکی ہوا سب جگہ موجود ہے کل
عالم پر محیط ہے کہیں معزول نہیں۔ اس کے قوا نہایت قوی ہیں وہ کارخانۂ عالم میں
بڑی کارفرما کارکن حسن آرا نفع رساں ہے۔ مگر باوجود اسکے ہمارے حواس خمسہ پر ہوا
کے پنہاں و عیاں ہونے کا عجب شیوہ ہے کہ اس میں عقل حیران ہے۔ یوں دیکھو
تو قوت باصرہ سے ہوا ایسی چھپی بیٹھی ہے کہ آنکھیں ہزار دیکھیں مگر وہ نظروں سے
پنہاں ہی رہے۔ مگر جب اس میں ایک خاص مقدار کے بخارات یکساں متساوی
مل جاتے ہیں تو وہ آسمان بن کر ہماری قوت باصرہ پر اپنا جلوہ عیاں کرتی ہے
اور کہتی ہے کہ حکمائے متقدمین جو آسمان کے قائل تھے اور اس کو بیرنگ بتاتے تھے
میں نے بھی ان کو دھوکا دیا۔ آسمان کا وجود نہیں ہے میں ہی ہوں کہ اپنا آسمانی
رنگ دکھاتی ہوں اور آسمان کہلاتی ہوں۔ دور کے پہاڑ جو جامۂ نیلگوں پہنے
نظر آتے ہیں یہ جامہ بھی میں نے اپنی ذات سے بنایا ہے۔ غرض اس نیلگوں
روپ کے سوا اور ہ اور رنگ میں بہروپ نہیں بھرتی۔

قوت سامعہ سے بھی نہاں رہتی ہے۔ کان اس سے ایسے آشنا نہیں ہوتے

کہ اسکے وجود کا ادراک کریں مگر ہاں جب کوئی جسم متحرک ہوتا ہے اور اپنی تحریک سے اس میں تموج پیدا کرتا ہے تو یہ تموج کان کے پاس دوڑ آتا ہے۔ کبھی مرغانِ خوش الحان کے نغمے اور سرود سراؤں کے راگ اور باجوں سازوں کی زیر و بم لاکر روح کو راحت پہنچاتا ہے، کبھی بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک سے دل کو ہلاتا ہے کہ یہ آوازوں سے دلخراشی کرتا ہے آپس میں آدمیوں میں باتیں کراتا ہے تو ہوا کان میں کہتی ہے کہ میں موجود ہوں، یوں ہزاروں طرح کی آوازیں نکال کر قوت سامعہ عیاں ہوتی ہے۔

قوت شامہ سے بھی ہوا پردے میں رہتی ہے مگر جب پھولوں کی خوشبو سے عطر اور نجاستوں کی بدبو سے متعفن ہوتی ہے تو ناک پاس آکر کہتی ہے کہ بو کی لانے والی میں ہی ہوں میرے سوا کوئی اور نہیں تو مجھے پہچان لے۔

قوت لامسہ بھی اپنے تئیں معمولی حالت میں عیاں نہیں ہونے دیتی مگر جب چلتی ہے تو اس کو بتلاتی ہے کہ میں تیرے سر اور پاؤں دبا رہی تھی مگر تجھے میری خبر کچھ نہ تھی اب جو میں نے پیر ہلائے ہیں تو تیرے بدن کو معلوم ہوا کہ میں بھی کوئی ہوں۔

قوتِ ذائقہ سے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں منہ کا نوالہ بنا کے نگل نہ جائے اس لئے وہ کبھی اُس کے منہ نہیں لگتی۔ اس سے ہمیشہ اپنا چہرہ چھپائے رکھتی ہے جب خالق جہاں کی وہ متضاد صفات عیاں و نہاں ہونیکی نشانیوں کا

یہ حال ہو تو اس ذی شان کی کیا شان ہو گی جو وہ قیاس و وہم و گمان سے برتر ہے۔
ہوا میں کیا انوکھی صفات ہیں کہ جب اوپر جائے تو آسمان بن جائے اور نیچے رہے تو جب تک خاک اڑا کر ہمارے چہروں پر نہ ملے تو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ موجود ہے۔ جب درختوں کے پتّوں کی کھڑکھڑ کی اور چڑیوں کی چوں چوں کی آواز کان میں آئے تو معلوم ہو کہ ہوا چھپی ہوئی اپنے روپ میں بہروپ بھر رہی ہے۔
اگر ہوا سے دنیا محروم ہو تو نہ کوئی جاندار جی سکے نہ کوئی نباتات اپنا سر زمین کے اندر سے باہر نکال سکے، نہ کوئی آواز سنائی دے۔ نہ کوئی بو سنگھائی دے، نہ شعلہ بلند ہو، نہ روشنی دکھائی دے نہ مردہ آتش کبھی زندہ ہو پھر تاریکی کا عالم وہ عالم پر چھا جائے جو ذی حیات کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پر چھا رہا تھا۔

یہ صانع عالم کی قدرت دیکھئے کہ ہوا سے دنیا کے کارخانوں میں وہ کارسازی اور صنع پردازی کر رہا ہے کہ جسے دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ ہوا پانی پر ہمارے جہازوں کو تیراتی ہے۔ پورب، پچھم، اتر، دکھن، کہاں سے کہاں لیجاتی ہے سنا سے لیکر قطب تک پہنچاتی ہے۔ ہمارے پمپوں میں پانی کو پستی سے بلندی پر لے جاتی ہے۔ ڈائونگ بیل (ظرف غواص جس میں بیٹھ کر سمندر میں اندر کی چیزیں اور موتی نکالتے ہیں) میں بٹھا کے سمندر کی تہ کے خزانوں کی کنجیاں ہمارے ہاتھ میں دیتی ہے۔ بیلون (غبارہ) میں بٹھا کر بادلوں کے اوپر لیجا کر آسمان سیر بناتی ہے۔

دیکھو کیا اوج و حضیض کے تماشے دکھاتی ہے۔ کبھی تحت الثریٰ کو لیجاتی ہے کبھی آسمان پر پہنچاتی ہے۔ بادلوں کو اپنی پیٹھ پر لادے لادے کہاں کہاں آدمیوں کو یہ بتلاتی پڑی پھرتی ہے کہ اپنے موسموں کے قواعد صحیح صحیح مرتب کرلو جب بادلوں کو نچوڑ کر ان کا عرق نکال دیتی ہے تو پھر ان کے بھوک کے پرزے پرزے اڑا کر ایسا پراگندہ کرتی ہے کہ کہیں ان کا نشان باقی نہیں رہتا حرارت کو اپنا رفیق و ہمساز بنا کر پانی کی یہ جونیں بدلتی ہے کہ مینھ۔ اوس، کہر، برف، اولا بناتی ہے۔ غرض یہ ہوائی سمندر کل جانداروں کے لئے مسرت حسانت منفعت کا سرچشمہ ہے

سب جانتے ہیں کہ ہوا ہماری جان ہے وہی زندگانی ابدان و مصلح صحت انسان ہے۔ دنیا کی صحت کے لئے بڑی طبیب حاذق ہوا ہے۔ اس کی معجون سے ضعیف قوی ہوتے ہیں۔ ہارے انھکے ماندہ تر و تازہ ہوتے ہیں۔ اس کی فرحت افزائی سے انسان تمام کلفتیں اور مایوسیاں بھول جاتا ہے اور زندہ دل شگفتہ خاطر ایسا ہو جاتا ہے کہ برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت کرنے لگتا ہے۔

کرۂ ہوائی کو روح اور عقل سے ایسا تعلق نہیں ہے کہ ہم اس کو کماحقہ جان سکیں۔ زمین کی طرح ہوا بہت سی چیزیں عقل و روح کے لئے پیدا کرتی ہے مورخ لکھتے ہیں کہ اسے تھنسر و یونان قدیمی مہذب قوموں میں علوم و فنون و

ہنرمندی و تہذیب و شائستگی میں پیش رو و پیشوا ہوا تو اس کا سبب اس کی تیز ہوا تھی جو پہاڑوں پر پنکھا جھلتی تھی۔

بڑے بڑے حکیموں نے لکھا ہے کہ وہ زمین بڑی مبارک ہے کہ جس میں ہوا کے جھونکے چلیں اور صاف دھوپ چمکے۔

کوئی اور قدرتی کارپرداز ایسا نہیں کہ وہ اپنے اکیلے دم سے ظاہر و باطن و نہاں و عیاں دور و نزدیک جہان کے اور اہل جہان کے لئے مختلف طرح سے اتنے منافع کثیر پیدا کرے۔ جیسا کہ یہ کرۂ ہوائی کرتا ہے۔ وہ جسم و جان کی آسائش اور جہان کی آرائش ہے۔ وہ مخزن آبی ہے جس سے مینہ کے بادل برستے ہیں۔ اور اس بارش سے دریا، چشمے، جھیل، نال بنتے ہیں۔ ہوا ادھر یہ کام کرتی ہے۔ ادھر وہ سطح آب پر اپنا داب ایسا ڈالتی ہے کہ سمندر اور چشموں سے بے انتہا بخار نہیں اٹھنے دیتی کہ وہ ایسے خشک ہو جائیں کہ پھر ان سے ہوا پنہاری بن کر پانی بھر سکے۔ کبھی ہوا جل کو تھل بناتی ہے اور کبھی تھل کو جل۔ جب ہوا میں ہل چل پڑتی ہے تو وہ انسان کی صحت و تندرستی کے لئے ایسے رویں لاتی ہے کہ جن سے تمام مقامی نجاستیں و غلاظتیں دور اور عفونتیں کافور ہو جاتی ہیں یا رک جاتی ہیں۔ ہوا اپنے چل چلاؤ سے مختلف قوموں میں آمد و رفت کو آسان کرتی ہے جس میں بالآخر ساری دنیا کی بہبودی ہوتی ہے۔

ہوا ہمارے جوف بدن میں پھیپھڑے میں سانس کے ساتھ نکل کر زبان کے

آتی ہے جس سے ہماری آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ جسم میں سے ان چیزوں کو باہر نکال دیتی ہے جو اُس کے لئے مضر ہیں۔ سب وقتوں میں سارے موسموں میں کل صورتوں و حالتوں میں ہوا کا کام یہ تھوڑا نہیں ہے کہ جہان کی آرائش و زیبائش کرتی ہے۔ اپنی صفائی و لطافت سے رخوں کو گلرنگ بناتی ہے۔ چہروں میں آب و تاب پیدا کرتی ہے۔ جسم و جان کو تازہ توانا کرتی ہے۔ جب وہ سو جاتی ہے تو تمام شگفتگی پر پژمردگی چھا جاتی ہے۔

نیچر کے سکون میں وہ بہار نہیں ہے جو اسکی حرارت میں ہے۔ یہ حرکت دینا ہوا کا کام ہے۔ سبزہ کا لہلہانا، پھولوں کا ٹہنیوں کا ہلنا، بادلوں کا سیر کرنا سمندر میں موجوں کا اٹھنا، لہروں کا لہرانا، کیا کیا بہار دکھلاتے ہیں یہ سب بہار ہوا کی بدولت ہے۔

ہواؤں میں خدا تعالیٰ اپنے حُسن و تدبیر و انتظام کا عجیب تماشا دکھاتا ہے ٹریڈ ونڈ چلاتا ہے۔ وہ وہاں ہمیشہ چلتی ہے جہاں سمندر بڑا فراخ کھلا چوڑا ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ بڑے دور و دراز ملکوں کے درمیان آمد و رفت کی رہنما بنتی ہے۔ پھر اور خوبی یہ ہے کہ جہاں ہوا بکار آمد نہیں ہوتی وہاں وہ نہیں جاتی۔ بلکہ جہاں جہاز راں کو ضرورت پڑتی ہے وہاں خدمت گزاری کے لئے حاضر ہوتی ہے۔ ساحل بھر کی ہوائیں جہازوں کو اپنی طرف لانے میں مددگار ہوتی ہیں۔ یہ ہوا بڑی زبردست ہوتی ہے اور بڑی اٹھکیلی چالوں سے

خراماں ہوتی ہے۔ منزل مقصود پر پہنچنے میں کسی قوت سے اپنی راہ راست سے انحراف نہیں کرتی۔ کبھی جوش خروش میں آنکر دیوانہ وار بھی چال اندھوں کی طرح نہیں چلتی جب وہ گلستانی سواحل کے گلگشت کو آتی ہے تو اپنے بازوؤں کے زور کو کم کر دیتی ہے اور دھیمی ہو جاتی ہے۔

برسات میں ہمارے دیس کے اندر اکثر پُروا ہوا چلتی ہے۔ وہ گرمی کی حرارت کو کم کرتی ہے مگر حبس سے ہمارا ناک میں دم کرتی ہے ہاضمہ میں خلل ڈالتی ہے۔ معدہ میں رطوبت پیدا کرتی ہے۔ بخار پھیلاتی ہے کبھی ہیضے سے ڈرا کر بیدم کرتی ہے۔ گرمی جاڑے میں پچھوا ہوا چلتی ہے۔ گرمی میں وہ بادِ سموم (لُو) بن جاتی ہے۔ تن بدن میں آگ لگاتی ہے۔ کبھی جان بھی نکال لیتی ہے۔ پروا ہوا نے جہاں جہاں پانی بھر اتھا وہاں وہ اسکے گھرے اڑا کر خاک اڑاتی ہے۔ کبھی کبھی اپنے زور و شور میں آکر آندھی کا طوفان اٹھاتی ہے۔ دیوؤں کی طرح دیواروں کو ڈھاتی ہے چھتوں اور درختوں کو پتوں کی طرح اڑاتی ہے عمارتوں کو زمین پر سُلاتی ہے۔ ہزاروں پرندوں کو درختوں سے گرا کر مردہ بناتی ہے ریگستانوں میں تودے کے تودے ڈھو کر ادھر سے ادھر لگاتی ہے۔ تری میں کشتیوں اور جہازوں کو توڑ پھوڑ کر خشکی میں لاتی ہے۔ بادلوں کی طرح کاٹ کھانیکو دوڑتی ہے۔ مگر کچھ دیر ٹھہر کر اپنی بھلمنسائی پر آجاتی ہے۔ اور مرمرسے نسیم بن جاتی ہے۔ پھولوں اور غنچوں پر عاشقانہ بوسے لیتی ہے۔

ہوا جیسی حیات کا سبب ہے ایسی ہی ہلاکت کا موجب ہے۔ آدمی کے اوپر تو نہیں مگر اور حیوانوں پر ہوائی جان ستانی کے تجربے کر سکتے ہیں۔ مگر حادثات اتفاقیہ ایسے صادر اور امراض ایسے عائد ہوتے ہیں کہ انسان پر ان تجربوں کو دکھا دیتے ہیں ہوا کے مارے ہوئے آدمیوں کی اور مکانوں میں آدمیوں کے گلا گھٹ کر مر جانے کی بہت سی مثالیں ہر سال مشہور ہوتی ہیں۔ اور آسیبوں اور جنوں کے او پر تھوپی جاتی ہیں مکانوں میں ہوا کی خرابی سے آدمی مرتا ہے تو کہتے یہ ہیں مرض نے مارا خدا ہوا کو بگاڑے نہیں۔ اس کے بگڑنے سے ملک کے ملک شہر کے شہر اور گھر کے گھر خالی ہو جاتے ہیں۔ حضرت عزرائیل کو دم بھر کی فرصت نہیں ملتی۔ کوئی اس سے زیادہ غضب الٰہی نہیں طاعون و وبا ہوا ہی کی سمیّت سے پھیلتے ہیں۔ بعض اطبا کی رائے یہ ہے کہ بری اور اچھی ہوائیں۔ ہنا صرف عادت پر موقوف ہے۔ جیسے فاسد ہوائیں ضعیف و کمزور حیوان اور انسان زندہ رہتے ہیں ایسے اس میں قوی اور زبردست نہیں رہ سکتے۔ مگر اس سے یہ سمجھنا کہ خراب و فاسد ہوا کا اثر مضر نہیں ہوتا سخت غلط فہمی ہے جو لوگ فاسد ہوائیں زندہ رہتے ہیں انکا مزاج ہوا کی برداشت کے قابل بن جاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے۔ اسکے خراب اثر نے اگر جان کو مردہ نہیں بنایا لیکن دل و دماغ و اعضا کی قویٰ کو کمزور اور پژمردہ تو کیا۔ جان کی سلامتی ہ اعضائے رئیسہ کی قربانی سے ہوئی۔

۱۰۔ موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ

(محسن الملک)

سرسید کے ہمراہیوں میں سب سے مشہور نواب محسن الملک کا نام ہے مہدی علی خان ۱۸۳۷ء میں بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان غریب مگر نہایت معزز تھا چنانچہ انہوں نے دس روپیہ ماہوار پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی مگر رفتہ رفتہ ترقی کرکے ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوئے اور اس عہدہ پر پہنچکر انہوں نے اپنی اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا۔ ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ جب انکی لیاقت کے افسانے حیدرآباد دکن پہنچے تو سالار جنگ نے انہیں بلا کر ۱۸۷۴ء میں محکمۂ مال کا انسپکٹر جنرل مقرر کر دیا۔ محکمۂ مال میں نہایت ضروری اور اہم اصلاحیں کرنیکے علاوہ، محسن الملک نے حیدرآباد اور مفصل میں بجائے فارسی کے اُردو کو عدالتی زبان قرار دیا۔ ۱۸۸۱ء میں انہیں وزیر مال مقرر کیا گیا۔ اور ۱۸۸۴ء میں فائننشل اور پولیٹیکل سیکرٹری کے معزز عہدے پر فائز ہوئے اور منیر نواز جنگ، محسن الدولہ، محسن الملک کا خطاب مرحمت ہوا۔ محسن الملک نے انگلستان کا بھی سفر کیا اور وہاں گلیڈسٹن سے ملاقات کی۔ آخرکار آٹھ سو ماہوار کی پنشن پر حیدرآباد کی ملازمت سے دست کشی کرکے علیگڑھ میں قیام کیا جہاں عمر کا بقیہ حصہ صرف کر دیا۔

سرسید کا ان سے پہلا تو واسطہ تھا اور لطف یہ ہے کہ یہ واسطہ معاندانہ حیثیت سے
شروع ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے سرسید کے خلاف ایک مضمون لکھا اور انہیں کافر قرار دیا مگر
رفتہ رفتہ انہوں نے سرسید کی اہلیت کو سمجھا اور آخر کار انکے نہایت پرجوش مددگار بن بیٹھے۔
رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں جاری ہوا اور محسن الملک نے اس میں بہت سے مضامین لکھے
اس رسالہ کا اجرا اردو کی ترقی کا ایک بڑا سبب سمجھنا چاہیئے۔ محسن الملک کے مضامین زیادہ تر
مذہبی اور تاریخی موضوعات پر ہوتے تھے اور انکا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو انکے موجودہ معائب
اور توہمات سے چھڑا کر اسی قدیم عظمت پر پہنچا دیں جس پر وہ ابتدائے عہد اسلام میں پہنچ چکے تھے۔
محسن الملک کے مضامین، جو مسلمانوں کی تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، اور سیاسی اصلاح وبہبود
کے لئے لکھے جاتے تھے، لائق مصنف کے تبحر علمی اور وسعت معلومات کا پتہ دیتے
ہیں۔ حالی لکھتے ہیں کہ سید مہدی علی نے، مسلمانوں کے دلوں کو، انکے اسلاف کے کارنامے
بیان کرکے جوش سے لبریز کر دیا ہے۔ انہوں نے سرسید کی تائید میں جو کچھ لکھا۔ قدیم اسناد
کے سلے سے لکھا۔ انکے بعض مضامین کافی بڑے ہیں اور نہایت تحقیق و تجسس کے بعد
قلمبند کئے گئے ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں کہ ہوسہائے ادب میں محسن الملک کو بڑے سے
بڑے ادیب سے برابری کا دعویٰ کرنے کا حق ہے اور ان کا اسلوب تحریر ایسا ہے جو انہی کے
لئے مختص ہے۔ درحقیقت انکے طرز تحریر میں بڑی قوت و سلاست اور بڑا حسن ہے۔
وہ نہایت صفائی اور سادگی کے ساتھ لکھتے ہیں اور ان کے استعارات و تشبیہات کے باعث
ان کا مطلب خبط نہیں ہونے پاتا۔ البتہ اگر انکی تحریر فارسی انداز پر ہوتی یعنی یہ کہ عبارت رنگین اور الفاظ

متعلق و تقبیل ہوتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات بالکل نہ باقی رہی اور تحریر میں ایک نہایت دلکش سادگی پیدا ہو گئی۔ ان کے مضامین کئی جلدوں میں شایع ہوئے ہیں۔ انہوں نے صرف ایک کتاب آیات بینات تصنیف کی ہے جس کا موضوع مذہب ہے اور جو مناظرے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ظفر علی خاں نے انہی کے کہنے سے "معرکۂ مذہب و سائنس" کو اُردو میں ترجمہ کیا۔

تصانیف۔ آیات بینات، مجموعہ لکچر، مضامین تہذیب الاخلاق، مکاتیب وغیرہ۔

ذیل کا مضمون تہذیب الاخلاق سے ماخوذ ہے۔

ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا۔ اور اُس طلسم کدے کو جہاں سب چیزوں کی شبیہہ اور تمام حالتوں کی تصویر مصوّر قدرت نے کھینچ رکھی ہے دکھایا۔ درحقیقت میں نے اُسے ویسا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانے کی مغربی جانب پہنچا تو ایک چار دیواری دیکھی جو میرے خیال سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ قدرت نے ایسا سنہرا رنگ دیا تھا کہ جب سورج کی کرن اس پر پڑتی تو وہ دیوار زرنگار کندن کی طرح چمکتی جس سے آنکھوں کو چکاچوند ہو جاتی۔ اُس دیوار کے چاروں طرف پھرا میں نے دروازہ نہ پایا۔ بلکہ ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے اور ایک بلندی پر ایک چشمہ دیکھا جس سے نہر میں پانی گرتا ہے۔

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرد تھا۔ اُس سے حقیقت اسکی

پوچھی تو اس نے کہا کہ اس کے اندر ایک ایسا پُر فضا باغ ہے جسے جنت عدن بھی دیکھے تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے شاداب کرنیکے لئے بنائی گئی ہے۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا۔ اپنے رہنما سے دروازے کا نشان پوچھا۔ اور میں نے اس کی کامل اطاعت اور تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا۔ میں اس دروازے کی محراب کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرے کی خوبی کیا بیان کروں! میں جاتے ہی بیتابانہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سیر سے سیر ہونا چاہا۔ میری اس بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا کہ "اے نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر کیا آسان ہے جسکا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد لحد ہے"! اخیر! میں نے ہوس کو روکا۔ اور خردسے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس کے بعد چند کیاریاں اس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر ان کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اُس باغ کے سبزے کا مستانہ جھومنا، قمری کی آواز، بلبلوں کا پھولوں پر گرنا۔ پھولوں کا کھلنا کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظر بازی۔ اور شمشاد کی سرفرازی نے مجھے ایسا مست کردیا کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔

میں چندے اُس باغ میں رہا۔ پھر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا۔ جس سے دل بہلاتا۔ اور اُس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور

باہر نکلا کہ کوئی مجھ سا ملے تو یہاں لاؤں اور اپنا دل خوش کروں۔

میں اُس باغ سے نکل کر برسوں اس تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ ملا آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی جسکی صورت بھی ویسی ہی تھی۔ نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھلا ہوا اور دیوار شکستہ اور کچھ نئی قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے میں نے اپنے رہنما سے پوچھا کہ یہ تو وہی باغ ہے مگر کیا سبب کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے نہ دروازے کی وہ رفعت و شان ہے نہر بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے؟ اُس نے کہا "یہ وہ باغ نہیں ہے دوسرا ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اس کو سکھا دیا اور زمانہ کے انقلاب نے پامال کر دیا۔

جب میں باغ کے اندر گیا تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر نہ وہ صفائی نہ وہ خوبی۔ نہریں بھی بہتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی میں وہ لطافت نہ وہ شیرینی پھول جتنے تھے سب کملائے ہوئے۔ میوے جس قدر تھے وہ سوکھے پڑے ہوئے۔ سبزے کے زمردین رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ گلوں کی سرخی پر زردی آگئی تھی نسیم کے بدلے صرصر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا۔ نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی حوض کی آنکھ اپنی خشکی پر رو رہی تھی۔

میں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند

خوبصورت ماہرو نوجوان آئے اور اُس نہر میں پانی پینے اور غوطے لگانے لگے۔ جب وہ نہا دھو کر اُس سے نکلے تو اُنکے چہرے بدلے ہوئے نظر آئے نہ وہ شکل وشمائل تھی نہ حرکات و ترمی۔ اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے کہ کسی کا سینگ ٹوٹا، کسی کا چہرہ بگڑا، کسی کا غصہ سے چہرہ لال ہوا۔ کسی کا کف مُنہ سے اُڑ کر مجھ تک پہنچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصہ کے تن گئیں۔ کسی کے مُنہ سے آواز غضب کے سبب نہ نکلی۔ اسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ایک عالی شان مکان کی طرف چلے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا، دُم طاؤس کی مانند، چڑیا کا پیٹ بیل کا، چال لومڑی کی ایک رنگین سمور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹرغوں کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان اسکے پاس پہنچے تو اس کے آگے گر پڑے، اُس نے ایک کریہہ ہولناک آواز سے ان کو پکارا اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ ان لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں جواب دیا کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا کہ اس وحشی آدمی نے کچھ خوش ہو کر کسی کا مُنہ چوما کسی کو پیار کیا۔ اور کسی کو "مرحبا" کہا۔

میں اس معاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے

اسرار کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا کہ "اس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے کہ سب ایسی شکل کے ہو جاتے ہیں جیسا کہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے یہ نوجوان نازک، ماہر و لڑکے بھی جب زیادہ پانی پئیں گے، خوب غوطے نہر میں لگائیں گے تو ایسے ہی ہو جائیں گے اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی یہ لڑائی نہ تھی بلکہ ان کا علمی مباحثہ تھا۔ جس کے لفظ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا تو رہنما مجھے چشمے کے کنارے لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ دو چشمے آ کر ملے ہیں۔ ایک سیدھا چلا گیا ہے جو نہایت صاف، پاک اور خوشگوار ہے۔ دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے جس میں جابجا تالے ندیاں ملتی گئی ہیں جو کثیف، میلے اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمے کے دہانے پر ایک پتھر کی چٹان آ گئی ہے جس سے صاف پانی نہیں آ سکتا۔ اور دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اُسی کا میلا بدبودار زہریلا پانی گرتا ہے اور وہی باغ میں جاتا ہے۔ جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے ان چشموں کا حال پوچھا۔ تو خرد نے تحقیق نامی رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اُس کے ساتھ میں ان دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدت کے بعد سب حال دریافت کر کے اس فکر میں پڑا کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب تاریخ نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اُس نے کہا کہ "ہزار برس ہوتے ہیں تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ سبزہ

شاداب تھا جیسا وہ باغ جو تم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمے کا پانی آتا تھا۔ اور گندے چشمے پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمے پر آگیا ہے۔

تب تو میں نے خیال کیا۔ اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں ہمت کو ساتھ لیکر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا اور پتھر سرکانے پر مجھ کو موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا۔ میرے رہنما نے کہا "اور بھی تیری طرح اس ارادے پر یہاں آئے مگر انکے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں جسکی روشنی سے یہ اندھے ہو کر بھاگ جائیں گے"۔ چنانچہ بصیرت کی مشعل اس نے مجھے دی۔ درحقیقت جب میں وہاں مشعل لیکر پہنچا تو کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ ہمدردی نامی واعظ میرے سامنے آیا اور کہا کہ "مجھے اجازت دو تو کچھ مدد کرنے والے لے آؤں"۔ میں نے خوش ہو کر اس کا شکر ادا کیا اور بڑے زور و شور سے اسے اپنی ہی صورت شکل والوں کے پاس بھیجا پر افسوس! کہ بہت کم لوگوں نے اسکی بات سنی۔ جو لوگ اس نہر کا پانی پی چکے تھے۔ وہ مارنے کو دوڑے اور جو لوگ ابھی اس سے بچے ہوئے تھے انکے کان بہرے ہوئے تھے انہوں نے کچھ نہ سنی۔ آخر وہ باحسرت و یاس واپس آیا۔ اس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا کہ اس خیال کو چھوڑ دوں اور یہ پتھر

جیسا ہے ویسا ہی رہتے دوں۔ پر استقلال نامی۔ ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا اور مجھے ایک تدبیر بتائی اس نے کہا میں نے ایمان نامی فقیر سے سنا ہے کہ اس چشمے کا ایک کھودنے والا ہے وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اس کی راہ میں اول تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے جس میں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اس سے بچ گئے تو رسوائی اور بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اس کا ملتا ہے جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی پس اگر تم کو اس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اس تک تمہاری رسائی ہوئی اور اس نے تمہاری نذر لے لی تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کریگا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے سب کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کریں گے اور تمہارے ساتھ پتھر سرکانے پر مستعد ہوں گے۔ آخر چند ہی روز میں گندے چشمے کا پانی بند کر کے صاف چشمے کے پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ

سرسبز و شاداب کریں گے تب یہ سوکھا ہوا باغ اس ہرے باغ سے بھی تمہاری
نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوشنما معلوم ہوگا کیونکہ نہ وہ باغ تمہارا باغ ہے نہ
وہاں کوئی تسلط ہے۔ اور یہ باغ تمہارا ہی ہے۔ اور سب تم سے ہیں۔ میں نے اس رفیق کا
شکریہ ادا کیا اور اسکے کہنے کے مطابق چلا کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے؟ جب میں
عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک نقطہ کی حقیقت مجھ سے
پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہہ کر "جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا وہ علوم و
فنون جدید کا باغ ہے جسکے پھل پھول ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانیوالا
وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا وہ ہمارے ہی
علوم قدیمہ کا باغ ہے جسکی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر
جو سرچشمے پر آگیا ہے جہالت ہے وہ ندی نالے کٹ گئے پانی کے رسم و رواج کی پابندی ہے
جسکی بنا تعصب۔ علم نما نادانی۔ جھوٹا زہد، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقریر، عامیانہ غلامی،
ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے
جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ
نہیں پاتے" چپ ہو رہا۔

۱۱- اہرامِ مصری

(محمد علی طبیب)

حکیم محمد علی حسن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے چند ناولوں کے مصنف تھے جن میں سے خاص خاص ، عبرت ، احسن ، سرور ، دیول دیوی ، گورا ، نیل کا سانپ ، رام پیاری ، جعفر عبّاسہ اور اخترِ حسینہ ہیں۔ ان میں سے بعض فسانے انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ نیل کا سانپ ، مشہور فسانہ نگار رائڈر ہیگرڈ کے ناول کلوپیٹرا کا ترجمہ ہے۔ دیول دیوی اور جعفر عباسہ تاریخی افسانے ہیں۔ حکیم محمد علی اُردو کے ناول لکھنے والوں میں گو قریب قریب سب پر فوقیت رکھتے تھے مگر تاہم ان کا شمار اول درجہ کے فسانہ نگاروں میں نہیں۔ ان کی کوئی تصنیف واقعاتِ حاضرہ سے متاثر نہیں۔ نہ ان میں اپنے زمانہ کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور نہ اس عہد کی معاشرت کی تصویریں پیش کی گئیں ہیں۔ جو کچھ ہے محض فرضی اور تخیّلی ہے اور صرف اس مقصد کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔ ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو انسانی فطرت سے بالکل واقفیت نہ تھی ، اور نہ وہ یہ جانتے تھے کہ انسانی جذبات کس کس عنوان سے معاشرت پر مؤثر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اعادہ کا بھی عیب ہے اور نصیحتوں کی یادتی بعض اوقات فسانے کو کتابِ پند و نصائح بنا دیتی ہے۔ ذیل کا مضمون اہرامِ مصری

ان کی ایک تاریخی تصنیف سے ماخوذ ہے۔

مصریوں کی فنِ عمارت میں ترقیاں

مصریوں نے عمارت کے فن میں جس قدر نام اور کمال پیدا کیا اور جس قدر اپنے اُن کمالوں کی جیتی جاگتی مثالیں چھوڑیں اسکی مثال اور کہیں خدا کی خدائی میں نہیں ملے گی۔ تھیبس (سید) کے عالی شان محل اور مند رمنصف کا قصر الشمع۔ منصف کا قلعہ۔ قلعہ کا وہ کنواں جو غلطی سے چاہ یوسف کے نام سے مشہور ہے۔ مگر مچھوں کے شہر کی بھول بھلیاں، میرس کی جھیل اور بہت سے بلند بلند مینار یہ ایسی ایسی عالیشان عمارتیں ہیں اور ان میں ایسی ایسی صناعیاں اور رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں کہ ان کو دیکھ دیکھ کر ایک سکتہ کی سی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسی عالم حیرت میں اس امر پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ مصری لوگ۔ ریاضی، ہیئت، علم المرایا اور جرِ ثقیل کے فن میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے تھے۔

عام اہرام مصری

اہرام مصری جو ہمارے اس مضمون کا اصلی موضوع لہ ہیں یہ مصر کے ہر حصّہ میں اس قدر کثرت کے ساتھ تھے کہ انکی صحیح تعداد بتانا اب قریب قریب غیر ممکن ہے مگر ناسخ التواریخ کا مورخ ان اہرام کی تعداد جو بعد طوفانِ نوحؑ کے مصر میں بنیں اٹھارہ بتاتا ہے جن میں سے اکثر زمانہ کے انقلاب کے ہاتھوں

نیست و نابود ہوگئیں۔ کچھ سلطان صلاح الدین کے نذر ہوئیں۔ کچھ مینار اپنی عمدگی کی وجہ سے سلاطین روم کو اس قدر پسند آگئے کہ مصر سے روم میں پہنچا دیے گئے۔ یہ مینار عموماً سنگی ہوتے تھے۔ جن کی وضع و صورت مختلف ہوتی تھی کوئی گول کوئی چوکور کوئی مثلث نما۔ کوئی اندر سے بالکل ٹھوس۔ اور کوئی جوف دار۔

ہرمان کا ذکر

اس موقع پر ہم آن دو مشارٹ میناروں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو سب میناروں سے بڑے ہیں اور جو الہرمان کے نام سے مشہور ہیں۔ ہرمان مشتق ہرم سے ہے جس کے معنی لغتِ عرب میں پرانے اور بوڑھے کے ہیں۔ یعنی یہ دونوں ایسی بڈھیا پرانی عمارتیں ہیں کہ اکثر آدمیوں کو اسکی خبر نہیں کہ وہ کب کی بنی ہیں اور کس نے بنایا ہے۔

ہرمان کی تاریخ تعمیر

بعض مورخ کہتے ہیں کہ حضرت انوشؑ نے جس سال اس دنیا سے انتقال کیا تھا اسی سال ہرمان بنائے گئے۔ بعضے اس کی قدامت بنا میں کہتے ہیں بُنِیَ الْہَرَمَانِ وَالنَّسْرُ فِی السَّرَطَانِ۔ یعنی ہرمان جب بنے ہیں تو نسر برج سرطان میں تھا۔ اس حساب سے ان ہرمان کو بنے ہوئے بارہ ہزار برس سے زیادہ کا عرصہ ہوچکا۔ اس لئے کہ علم ہیئت کی رو سے اب آج کل نسر اواخر جدی میں ہے اور کسی برج کو بارہ ہزار برس سے کم میں قطع نہیں کرسکتا۔

بعض کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے ہرمان کی بنیاد کا پتھر رکھا تھا۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مصر کے کسی بادشاہ نے ان کی قدامت بنار کے متعلق سب سے زیادہ مشہور عام روایت یہ ہے کہ یہ طوفان نوحؑ سے پیشتر کی بنی ہیں۔ طوفان کا پانی ابھی تنور سے نکلا نہیں تھا اور دنیا اپنے پرانے طور طریقے سے آباد تھی کہ مصر کے ایک بادشاہ نے جو غالباً چھیویں ہوگا ایک شب ایک نہایت ہولناک اور پریشان خواب دیکھا اور اسی خواب کے ذریعہ سے اس کو یہ انتشار پیدا ہوا کہ جو کچھ علوم و فنون حضرت ادریس علیہ السلام سے اب تک دنیا میں پھیلے ہیں ان سب کو پانی کی طوفان خیز موجیں صفحۂ دنیا سے عدم میں بہا لیجائیں گی اور دنیا یوں ہی جاہل رہ جائے گی اس خیال سے اس نے دریائے نیل کے غربی جانب ان اہرام کو بنایا اور ان میں وہ سب علوم طب اور حکمت کے ودیعت رکھے جو اب تک دنیا میں پھیلے ہیں۔

ان اختلافات کے دیکھنے سے ہم یہ تو یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ حقیقت میں یہ ہرمان کب کے بنے ہوئے ہیں مگر ہاں یہ تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ یونان کی علمی ترقی سے ان ہرمان کی عمر ضرور زیادہ ہے اس لئے کہ جالینوس نے اپنی تصنیفات میں ہرمان کا ذکر کیا ہے جس طرح اسکی قدامت بنا میں مورخین کا اختلاف ہے اسی طرح اسکے اس قدر زمانے میں بھی اختلاف ہے جس قدر زمانہ میں یہ بن کر طیار ہوئیں۔

کس قدر زمانہ میں ہرمان تعمیر ہوئے

تاسخ التواریخ کا مورخ اسکی مدت اپنی تاریخ

میں چھ مہینے بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس پر یہ عبارت لکھی تھی قُل لِمَن یاتی بَعدَنَا بَهدِمُهَا فِی سِتَّمَائَةِ عَامٍ وَقَد بَنَینٰهَا فِی سِتَّةٍ اشهُرٍ وَالهَدمُ اَیسَرُ مِنَ البُنیَانِ یعنی ہمارے بعد کے آنیوالوں سے کہدو کہ اس عمارت کو بھلا وہ چھ سو برس ہی میں کھود ڈالیں جس کو ہم نے چھ مہینے میں بنایا ہے۔ بنانا تو کھود ڈالنے سے بہت سہل ہے" اور ابن بطوطا نے سفرنامہ میں اسی روایت کو اس طرح لکھتا ہے۔ اس عمارت کے بنانے میں ساٹھ برس تک بہت سا سلغدی سے کام لیا گیا تھا اور اس پر یہ لکھا گیا۔ بَنَینَا هٰذِهِ الاَهرَامَ فِی سِتِّینَ سَنَةٍ فَلیَهدِمهَا مَن یُرِیدُ ذٰلِکَ فِی سِتِّمِائَةِ سَنَةٍ فَاِنَّ الهَدمَ اَیسَرُ مِنَ البِنَاءِ۔ یعنی ہم نے تو اس اہرام کو ساٹھ برس میں بنایا ہے مگر جو اس کے ڈھانے کا ارادہ رکھتا ہے وہ بھلا اس کو چھ سو برس میں تو ڈھائے حالانکہ بنی ہوئی عمارت کا کھود ڈالنا اسکے بنانے سے بہت سہل ہے

اس موقع پر سب سے زیادہ معتبر قول ہیروڈوٹس کا معلوم ہوتا ہے جس نے مصر کی قدیم تاریخ بھی لکھی ہے یہ مورخ سنہ عیسوی سے چار سو برس پیشتر مصر کی سیر کو آیا تھا وہ لکھتا ہے " اس مینار کو سنہ عیسوی سے نو سو برس پیشتر چیوپس مصر کے بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اسکے بنانے میں ایک لاکھ آدمیوں کی

ہمیشہ مدد لگی رہتی تھی۔ ہر سہ ماہی میں انکی بدلی ہوتی تھی۔ اور اسی قدر نئے آدمی لگادیے جاتے تھے۔ اس مینار کے لئے عرب اور انتھوپیا میں پتھروں کے تراشنے اور وہاں سے مصر تک لیجانے میں پورے دس برس لگے تھے۔ اور بیس برس اس وسیع عمارت کے بنانے میں گزرے تھے جس کے اندر بیشمار کمرے اور بہت سے مکانات ہیں اس مینار پر مصری حرفوں میں لکھا ہے کہ کاریگروں کے صرف لہسن اور پیاز کی چٹنی میں اُٹھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوئے ہیں۔

اس حساب سے اگر اس عمارت کی پوری تکمیل میں ابن بطوطہ کے قول کے موافق ساٹھ برس لگے ہوں تو کچھ تعجب بھی نہیں۔

ان دونوں میں جو بڑا مینار ہے وہ چیوپیس کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اس سے چھوٹا مینار ہے وہ کیفونیس کے نام سے چیوپیس والا مینار شہر منفؔ کے قریب نیل سے پانچ میل اور مقام جیزہؔ کے سامنے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مینار ایسا خوشنما ہے کہ اسکا شمار آج دنیا کے سات عجائبات میں سے اول نمبر پر ہے۔

بڑے اہرام کی بیرونی صورت

یہ ایک مخروطی شکل کا مثلث نما چوپہل مینار ہے جس میں کسی طرف دروازہ نہیں ہے۔ اور جو بہت سخت پتھر پر سخت پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے بنایا گیا ہے اس کی جو پیمایش کی رو سے ساڑھے سولہ بیگہ زمین کے رقبہ کو گھیرے

ہوئے ہے یہ جز حقیقت میں ایک مربع چبوترہ ہے جس کا ہر ضلع سات سو تریسٹھ فٹ لانبا ہے اور اس کی بلندی چار فیٹ آٹھ انچھ ہے۔ اس وسیع اور مربع چبوترے پر ہر طرف سے کسی قدر چبوترے کی سطح چھوڑ کر ایک دوسرا چبوترہ بنایا گیاہے اسی طرح کچھ کچھ گھٹا کر اس مینار کی چوٹی تک اوپر تلے دو سو تین چبوترے بنائے گئے ہیں۔ اور ان چبوتروں کے اس طرح بتدریج گھٹتے جانے سے نیچے سے اوپر تک سیڑھیوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے جن کے ذریعہ سے بہت آسانی کے ساتھ وہ پتلی کمر والی لیڈیاں بھی اس مینار کی چوٹی تک چڑھتی چلی جاتی ہیں جو یورپ سے اس مینار کے دیکھنے کے لئے یہاں تک آتی ہیں۔ اور ذرا جھٹکا بھی ان کی کمر میں نہیں پہنچتا۔ اس کی بلندی نیچے سے اوپر تک چار سو چھپن فٹ کی ہے اور بعض قدیم مورخوں کا بیان ہے کہ یہ مینار آٹھ سو فٹ کے قریب اونچا تھا نیچے کھڑے ہو کر جب آپ اس کی بلند چوٹی کی طرف نظر دوڑائیں گے جو آسمان سے باتیں کر رہی ہے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس کی چوٹی ایک نقطہ پر جا کر ختم ہو گئی ہے لیکن جب آپ چوٹی پر پہنچکر دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جس کو ابھی ایک نقطہ خیال کرتے تھے وہ حقیقت میں دس گز مربع کا چبوترہ ہے۔ سیاحوں کا یہ عام مقولہ ہے کہ سارے یورپ میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں کزنس صاحب اس مینار کی پیمائش کے لئے یہاں آتے تھے

انہوں نے اس کی پیمائش کا حال اس طرح لکھا ہے "مینار کی جڑ جو پہل ہے اس کا ہر ضلع ایک سو دس فادم کا ہے اور اس کے اوپر کے چاروں طرف کے ضلعے مثلث گویا متساوی الاضلاع ہیں اس سے مینار کے قاعدے کی کل سطح بارہ ہزار ایک سو فادم مکسر ہوئی۔ اور سیدھی بلندی اس مینار کی کچھ زیادہ ستر فادم کی ہے پس تمام جسم اس مینار کا تین لاکھ تیرہ ہزار پانسو نوے فادم ہوا" العظمۃ للہ۔

یہ مینار پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں سے بنایا گیا ہے جن میں چھوٹے سے چھوٹا پتھر بھی تیس فٹ یعنی دس گز کا لانبا ہے اس موقع پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ مصریوں کے پاس وہ کونسا جر ثقیل کا فن تھا کہ جس کے زور سے وہ اس زمانہ میں پتھروں کی ایسی بڑی بڑی چٹانیں اس قدر بلندی پر چڑھا لیگئے۔

ان پتھروں کے وصل میں مصریوں نے ایسی ایسی صناعی کی ہے کہ گو ہزارہا برس ہوگئے ہیں مگر پتھروں کے جوڑ توڑ اور انکا معلوم ہونا تو ایک طرف مصالحے اور چونے کا اینک کہیں اثر بھی تو نہیں معلوم ہوتا۔ یہ پتھر بہت نفاست کے ساتھ گڑھے گئے ہیں اور ان پر جابجا مصری حرفوں میں کتبے کندہ ہیں۔ اس مینار پہ چڑھکر اگر اس کا لطف دیکھیں گے تو دیکھنے والے کو ایک عجیب و دلفریب سین نظر آئیگا سارا مصر اپنا خوبصورت اور دلکش منظر دکھانیکے لئے آنکھوں کے نیچے ہوگا دکھن کی طرف رود نیل کا پانی بڑے لطف کے ساتھ لہریں لے رہا ہے۔

کشتیاں متوالی چالوں سے ایک ادا کے ساتھ چل رہی ہیں۔ پالیں اڑ رہی ہیں اور کچھ ایسے تماشے نظر آرہے ہیں کہ جن کا لطف کچھ دیکھنے ہی سے خوب تعلق رکھتا ہے۔ اُتر کی طرف اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے ہیں جیسے نیلے آسمان سے ملے ہوئے کچھ عجیب سبزی پیدا کر رہے ہیں یا پھر کوسوں تک ریگستانی میدان ہیں جنکے بڑے بڑے ذرے عجیب دلفریبیوں کے ساتھ دھوپ میں چمک رہے ہیں پچھاں کی طرف فیوّن کا جنگل ہے جسکی سرسبزی طرح طرح کے خودرو پھولوں کے شوخ رنگ بھرے بھرے چمنوں کو شرمائے دیتے ہیں اور پورب کی طرف جیزہ اور قسطاط کے مشہور برج۔ القاہرہ کا مینار اور سلطان صلاح الدین کا قلعہ عجیب لطف دکھا رہے ہیں۔

اس مینار کی اندرونی کیفیت

چیوپیں بادشاہ نے جب اس مینار کو بنوایا تھا تو اس میں کسی طرف کوئی دروازہ نہیں رکھا تھا گویا وہ ایک طلسم تھا جس کی اندرونی حالت لوگوں کی نظر سے بالکل چھپی ہوئی تھی۔ لیکن ۸۲۰ء میں جب خلیفہ مامون مصر میں آیا تو اس مینار کی بیرونی کیفیت دیکھ کر اس کے دل میں اس امر کا شوق چرّایا کہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت کی اندرونی حالت بھی دیکھنی چاہئے۔ اس نے فولادی ٹانکیوں کے ذریعہ سے بمشکل اس مینار میں آنے جانے کے قابل ایک راستہ کر پایا اور اس وقت سے اس عمارت کی اندرونی حالت لوگوں کو معلوم ہو چلی۔

اس موقع پر اسلامی دنیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ اس عمارت کے بنانے والے بادشاہ نے اس وقت کے لائق نجومیوں سے اس امر کو دریافت کیا کہ یہ عمارت کسی طرف سے کبھی کھولی جائے گی؟ تو منجموں نے اپنے علم کی رو سے جواب دیا کہ ہاں شمالی جانب سے اس مینار میں راستہ کیا جائیگا۔ اس مقام کا تعین بھی انہوں نے کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس قدر روپیہ اس راستہ کے کرنے میں خرچ ہو گا۔ اس عمارت کے بنانے والے بادشاہ نے اسی قدر زرنقد اسکے اندر رکھ دیا۔ جب خلیفہ ماموں کا زمانہ آیا اور اس نے اہرام کے کھدوانے کا قصد کیا تو مصر کے بعض بعض مشائخ اس ارادے سے اس کو روکتے بھی رہے مگر اس کے اشتیاق نے نہ مانا اور بالآخر اس نے حکم دے ہی دیا کہ شمالی طرف سے یہ مینار کھودنا شروع کیا جائے۔ آگ اس پر خوب جلائی جاتی تھی اور جب وہ مقام خوب گرم ہو جاتا تھا تو اس پر تیز سرکہ ڈالا جاتا تھا اور پھر ٹانکیوں سے وہ جگہ کھودی جاتی تھی۔ اس ترکیب سے بمشکل تمام اس طرف ایک راستہ اندر جانے کے قابل کر پایا تو اسی مصنوعی دروازے کے سامنے کچھ زرنقد رکھا ہوا پایا۔ خلیفہ کے حکم سے جب یہ زرنقد وزن کیا گیا تو حساب لگانے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ زرنقد بلاکم و بیش اس روپیہ کے برابر تھا جو ماموں نے اس راستہ کے کرنے میں اپنے خزانہ سے خرچ کیا تھا جس پر ماموں کو بہت

حیرت ہوئی اور اندر سے اس دیوار کا آثار بیس گز کا نکلا۔"
اس مینار کے اندر متعدد مکانات اور کمرے ہیں جو بہت نفاست۔استحکام اور قرینے کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔اور ان عمارتوں کے اندر پانی کی ضرورت سے مستغنی کرنیکے لئے اس مینار کے نیچے ہی نیچے بہت تعجب خیز طریقے سے پانی آنے کا ایک وسیع راستہ بنایا گیا ہے۔جس کا منبع رود نیل سے ملا ہوا ہے جب ماموں اس کے اندر گیا تو اس میں اس کو ایک راستہ ملا جو اس کے حق میں خضر بن کر اس کو ایک چوکھنٹی باولی پر لے گیا جسکے چاروں طرف دیواروں میں متعدد کمروں کے دروازے بنے تھے جن میں بیٹھ کر دیکھنے والوں کو اس باولی کا کچھ عجیب ہی لطف ملتا ہوگا۔اس کے اندر ایک وسیع کمرے میں بہت سی لاشیں جن کو عربی میں مومیائی اور انگریزی میں تھوڑے تغیر کے ساتھ ممی کہتے ہیں کتاں میں لپٹی ہوئی ملیں۔ یہ اُن مصریوں کی لاشیں تھیں جن کو مرے ہوئے ہزارہا برس ہوگئے تھے مگر کچھ ایسے مصالحے ان میں دیئے گئے تھے کہ ان کے سر کے بال اور ہاتھ اور پاؤں کے ناخن بھی اب تک بدستور قائم تھے اور کسی جگہ سے ان پر بوسیدگی کا کسی طرح کا اثر نہیں دیکھا جاتا تھا۔بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی مرے ہیں اور اگر بول بھی اُٹھیں تو تعجب نہیں۔
اس کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ تھا جس میں پتھر کا ایک صندوق

رکھا ہوا تھا اور صندوق میں ایک آدمی کی مورت۔ اس مورت کے سینے پر سونے کا ایک سینہ بند رکھا تھا جس میں قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے اور سونے کے پتر پر جا بجا کچھ ایسے حروف کندہ تھے جن کو اب کوئی پڑھ نہیں سکتا تھا اور اسی وجہ سے اس کی کچھ اصلیت کسی کو نہ معلوم ہو سکی۔

انہیں کمروں میں سے ایک اور کمرے میں ایک خالی قبر بھی ملی جو ایک نہایت افسوسناک سین دکھانے کے ساتھ اس امر کی نصیحت کر رہی تھی کہ مرنا جینا تو کسی کے اختیار میں ہے ہی نہیں مگر یہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہے کہ جس جگہ کوئی چاہے وہاں دفن بھی ہو۔ یہ کس کی قبر تھی؟ اور اس کی مٹی اس کو کہاں لے گئی؟ اس کا جواب ذرا مشکل ہے۔ مگر غالباً چیوپیس نے قبر اپنے ہی لئے بنوائی ہوگی مگر آہ جس کے وسیع اختیارات میں ایسی بڑی عالی شان عمارت کا بنوانا تھا اس نے اپنے بزرگوں کی نعشوں کو تو اس میں جگہ دی مگر آہ اس کے مقدر میں اتنی بڑی عمارت کے ایک گڈھے میں بھی سونا نہ بدا تھا۔ افسوس! افسوس!! عبرت۔ یہ قبر ایک بہت بڑے پتھر میں تراشی گئی تھی تین فٹ گہری تھی۔ تین فٹ چکلی۔ اور چھ فٹ سے کچھ زیادہ لانبی تھی۔

رولن صاحب لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی چند سیاح اس عمارت کے اندر گئے اور اس باولی میں جو اینٹ پتھر اور مٹی پڑی ہوئی تھی نکال کر دیکھا تو

معلوم ہوا کہ وہ باولی دو سو سات فٹ گہری ہے۔ اور اکثر لوگ گمان کرتے ہیں
کہ ابتک اس کی تھاہ نہیں ملی۔ اسی مینار کے اندر انہوں نے دو کمرے
پائے جن میں سے ایک کمرہ ساڑھے چونتیس فٹ لانبا سترہ فٹ چوڑا اور
سوا اُنیس فٹ اونچا ہے۔ اس کی چھت پتھر کی بڑی بڑی پٹیوں سے جو
سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ فٹ لانبی تھیں پٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر
پتھر کا ایک صندوق ساڑھے سات فٹ لانبا۔ سوا تین فٹ چوڑا اور
پونے چار فٹ اونچا رکھا ہوا ہے اس عمارت میں اکثر پتھر نو فٹ لانبے
ساڑھے چھ فٹ چوڑے اور چار فٹ سے زیادہ موٹے لگے ہوئے ہیں۔"

۱۲۔ ترکی سے اُردو کا مقابلہ

(امجد علی اشہری)

مولوی سید امجد علی اشہری اُردو زبان کے بہت بڑے ادیب تھے۔ تمام عمر علمی مشاغل میں بسر کی نثر لکھنے والوں میں اُستادی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ بہت سی ادبی اور تاریخی کتابیں آپکی تصانیف سے ہیں۔ اپنے زمانہ کے تمام چوٹی کے رسالوں میں ان کا کلام نظم و نثر شائع ہوتا رہا ہے۔ تذکرے لکھنے میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔ اشہری مرحوم نے جو کتابیں لکھی ہیں ادبی حیثیت سے بہت بلند پایہ ہیں۔ اور اہل علم کے نزدیک مستند سمجھی جاتی ہیں۔ انکی تحریر میں سلاست، سادگی اور صفائی جو ایک نقاد و تذکرہ نگار کی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہ انگریزی ادبیات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جملہ تنقیدیں جدید اصول تنقید مدنظر رکھ کر لکھی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انکی تصانیف میں ایک نمایاں علمی و ادبی شان موجود ہے۔

تصانیف حیاتِ انیس، ایشیائی شاعری، نورجہاں بیگم، ٹیپو سلطان، حیدر علی سلطان، لغات الخواتین، ادیب، قومی نظم، اُردو کی ڈالی، اُردو کا گلدستہ، مکالمہ مرد و عورت، مرقعِ تاج پوشی۔

ذیل کا مضمون حیاتِ انیس سے ماخوذ ہے۔

ترکی اور اُردو ایک ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ اور دونوں کے مدارجِ ترقی بھی قریب

قریب زمانہ کے پائے جاتے ہیں۔ ترکی نے استنبول میں سلاطین عثمانیہ کے زیرِ نشاں اور اُردو نے دلی میں سلاطین مغلیہ کے زیرِ پرچم نشو و نما حاصل کیا۔ پھر شعراء و ادباء نے دونوں کی زمین سخن کو آسمان بنایا۔ ہندوستان میں ترکی کا رواج نہیں۔ تھوڑے زمانے سے جناب انشاءاللہ خاں صاحب مدیر وطن نے اردو میں ترکی کے حالات کا اظہار کیا ہے اس کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمد چہارم کے عہد میں ترکی شعراء نے ایرانی طرز کی تقلید شروع کر دی تھی اور "نابی" نے میرزا صائب کی تشبیہات اور نازک خیالیوں کی نقل اتار کر ترکی لٹریچر میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ کیا تھا۔ پھر سلطان احمد ثالث کے عہد (۱۷۳۰ء) میں سب سے زیادہ مشہور "ندیم" شاعر گزرا ہے جو ممتاز ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنے انداز تحریر کا جو تمام ایرانی اور ترکی شعراء سے جداگانہ قسم کا تھا موجد گزرا ہے اور اب تک کسی کو اس کے نقل و تقلید کی جرأت نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی نے اسکی تقلید کا حوصلہ کیا تو اُس کا کلام اُس رتبہ کو نہیں پہنچا جیسے فارسی میں فردوسی اور اُردو میں میرزا غالب کی نظیریں موجود ہیں۔

لیکن اس کے کلام میں میرزا غالب کے کلام جیسا اغلاق نہیں بلکہ وہ میر تقی کے کلام کی طرح سادہ و پرکار ہے۔ اس کا طرز تغزل بے نظیر خوبیوں سے آراستہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد بھی لکھے ہیں جو فارسی قصائد کے شان و شکوہ کا اظہار کرتے ہیں اور باایں ہمہ وہ اعلیٰ مطالب کو نہایت سلیس پیرایہ میں ادا کرتا ہے وہ

۱۷۲۳ء میں زندہ تھا مگر انکی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اسکی تصنیف پر عثمانیہ لیٹریچر کا کلاسیکل زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لٹریچر کے فروغ کی ابتدا ارتقی سے ہوئی اور ندیم کی وفات پر وہ دور ختم ہوا یعنی احمد اول کی تخت نشینی (۱۶۰۳ء) سے لیکر احمد ثالث کے عزل (۱۷۳۰ء) تک رہا۔

پرانے طرز کے شاعروں میں چار شاعر سب سے زیادہ نامآور ہوئے جنکے تخلص فضولی، نفعی، ندیم، غالب ہیں۔ شیخ غالب سلطان سلیم ثالث کے عہد سلطنت میں گزرا ہے۔ اُس کی کتاب "حسن و عشق" شاعرانہ نازکخیالی میں بے مثل خیال کی جاتی ہے۔ اور یہ چاروں شاعر اپنے اپنے طرز کلام میں جو ہر فرد سمجھے جاتے ہیں اور ہر ایک نے شاعری کو اپنے مذاق کے حسب حال ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ غالب استنبول نے بھی غالب دہلوی کی طرح دوسرے کی تقلید کو پسند نہیں کیا۔

سلطان محمود کے عہد میں ترکی لٹریچر کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور ترکی شاعری نے یورپین لٹریچر کی وضع اختیار کی جو بہت جلد ترکی شاعری کا ایک خاص فیشن بن گیا۔

اس دور کے مشہور شاعروں میں واصف اور عزت مولا ہیں اور شاعرات میں فطنت اور لیلیٰ کے کلاموں کو قبولیت خاص حاصل ہے۔ واصف پہلا ترکی شاعر ہے جس نے قسطنطنیہ کی عام بول چال کو شاعری میں داخل کیا۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں اس دور کی تکمیل کا لگا لگا۔ ذہب سے ہندوستان میں

اُردو کا پچھلا دور شروع ہوتا ہے) اور ترکی شاعری کی روح نئے قالبوں میں ڈالی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی لٹریچر کا بالکل کایا پلٹ ہوگیا جو دورِ اوّل و اوسط سے بالکل نئے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔

اس دور کا عام مذاق اس اصول کا پابند ہوگیا ہے کہ شاعری میں صرف آمد کی خوبیاں ظاہر کی جائیں آورد کے تصنع کو بالکل دخل نہ دیا جائے۔ پُرانی مسجّع اور مقفٰے عبارتوں اور پیچیدہ اور مغلق ترکیبوں کی جگہ سیدھے سادہ الفاظ اور عام بول چال کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اچھے لکھنے والوں کو عمدہ عمدہ الفاظ اور محاورات کی تلاش کرنا پڑتی ہے لیکن وہ اشعار کی رنگینی کیلئے نہیں ہوتی بلکہ واقعات اور مدعا کو بہترین طریق سے ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ ترکی نظم بھی تقریباً یوروپین طرز کی ہوگئی ہے۔ اکثر پُرانے الفاظ بے فائدہ ہونے کی وجہ سے متروک ہوگئے ہیں اور بیشمار الفاظ معانی میں جدید خیالات اور تصورات کو ادا کرنے کی ضرورت کو پورا کرنیکے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ڈراما نویسی کا بھی رواج ہوگیا ہے جو پہلے وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا اور اُردو میں ابتک اس کا چرچا نہیں۔ پُرانے زمانہ کے شیفتہ اور ایرانی تقلید کے فریفتہ ابتک اس طرز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر زمانہ کی رفتار کو کون روک سکتا ہے۔ یہ بات ترکی ادبا و شعرا کی خاص ذہانت اور قابلیت کی نفی کہ انہوں نے اپنے مذاق میں مغربی لٹریچر کی نقل اُتاری جس نے اُن کو ترکی کے پُرانے

پیچیدہ راستوں سے نکال کر ایک نہایت صاف و ہموار شاہراہ پر لگا دیا ہے۔ اس تغیر و انقلاب میں زیادہ تر فرنچ زبان کی خوبیوں نے اپنا اثر ظاہر کیا اور پیرس شیراز کا قائم مقام بن گیا لیکن ابھی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک اور ضروری عنصر شریک ہونے کو باقی تھا۔ اس کی ابتدا اعلیٰ حضرت سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ و اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی۔ اور جیسے آپ کے عہد میں علوم و صنائع نے ممالک عثمانیہ میں غیر معمولی ترقی کی اور تمدن کے ہر شعبے میں ایک نئی ترقی نمودار ہوئی ویسے ہی ترکی لٹریچر اور شاعری میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا یا یوں کہو کہ غم کی جگہ خوشی نے حاصل کی اور آرزو نے مایوسی کی جگہ دخل پایا۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ اب سے بیس برس پہلے قسطنطنیہ کے ہر گلی کوچہ میں پیرس کے نازک خیال اور نفیس طبع لوگوں کی زبان سنائی دیتی تھی۔ آج اسی طرح دوکان دوکان پر مستعد اور جفاکش اور نازک خیالی کو چھوڑ کر عملی جد و جہد کو مقدم سمجھنے والے بہادروں اور اعلیٰ درجہ کے صناعوں، تاجروں، سائنٹفک ماہروں، ہر علم و فن میں کمال رکھنے والوں اور بے نظیر سپاہیوں کی قوم (یعنی قوم جرمن) کی زبان بولی جاتی ہے۔

سلطان محمود جنت آشیاں نے قوم کو اسکی مخالفت کے باوجود پستی و تنزل سے نکلنے اور ترقی کرنیکے وسائل سے آگاہ کیا۔ اور نئی عمارت کی بنیادیں تیار کیں۔ اسکے بیٹے کے عہد میں دور اندیش وزراء نے اسی عمارت کو اور بڑھایا اور چونکہ فرانسیسیوں کی زبان اور خیالات موجودہ ضروریات

کے جمیع لوازم کو ساتھ لئے ہونیکے علاوہ بہت کچھ ایشیائی مذاق سے
مشابہت رکھتے تھے۔ اس کو اپنی قوم کی عام تعلیم کے لئے اس قوم کا شاگرد رشید
بنا دیا ہے جس کی دنیا کے ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی دیکھی جاتی ہے۔

فرانسیسی رنگ نمایاں طور پر جن ترکی مصنفوں کی تحریروں میں پہلے پہل
دکھائی دیا وہ عاکف اور رشید پاشا ہیں۔ لیکن اصلاح کے اس ابتدائی مرحلے کو
کمال تک پہنچانیکا فخر شناسی آفندی کو حاصل ہوا ہے جو [illegible]ء میں فوت ہوئے اس
میدان میں کمال بک شاعر اکرام بک اور حامد بک نے شناسی کو بنظیر مدد دی۔
فرانسیسی مذاق کے غلبہ کے زمانہ میں ترکی شاعری کا رنگ و انداز اور ٹون کمال رقت انگیز
اور اداسی سے بھرا ہوا تھا۔ اور ترکی شاعر زیادہ تر مرجھائے ہوئے پھول ناکامیوں اور ہجوم افکار
کے رنج و صدمات سے گھل گھل کر عنقریب آغوش لحد میں سونیوالی نازنین لڑکیوں اور
دوسرے ایسے ہی رقت انگیز مضامین پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے جنکی شیریں مگر غم انگیز نظموں
کو پڑھکر خود بخود یہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ ایک بہادر لیکن رحمدل قوم اپنے انجام
کو قریب پہنچتا ہوا دیکھ کر بعالم بے خبری و محویت بلا کسی قصد کے اس تصور سے
اطمینان کر رہی ہے کہ تمام خوبصورت چیزوں کا انجام بھیانک موت ہے۔ مگر خدا
کا شکر ہے کہ ترقی قوم اور اسکے شعراء کے خیالات اور تصورات کی اب یہ کیفیت
نہیں رہ گئی۔ اب سے بیس سال پہلے پولیٹکل اور تمدنی حالت ہی ایسی مایوسی
بخش ہو رہی تھی کہ اگرچہ جدید فرانسیسی شاعری کی زنانہ نازک طبعی اور رقت انگیزی کا

اثر بھی ہوتا تو بھی خود بخود قوم اور اسکے انتشار پرداز وں پر گردوپیش کے حالات دیکھکر مایوسی کے طاری ہوجانیکے لئے کافی اسباب موجود تھے لیکن اب جرمنوں مردانہ لٹریچر کے اثر اور ذاتی استحکام وطاقتوری کے علم سے ترکی لٹریچر اور نظم میں پھر وہی شجاعانہ عزم استقلال اور مردانہ شگفتگی - فاتحانہ امنگیں، حب الوطنی کا جوش اور پیش قدمی و نصرت کی پائیندگی ٹپک رہی ہے جو فاتح شام ومصر وایران و عرب جانبازوں کی رجزوں سے ٹپکا کرتی تھی -

ہم نے یہ خیالات تاریخ خاندان عثمانیہ سے اخذ کئے ہیں - اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُردو نے ترکی سے زیادہ نشو و نما کا اظہار کیاہے - اور جو طاقتیں ترکی کو میسر ہوئیں اور میسر ہیں وہ اُردو کو میسر نہونے پر بھی اُردو نے بہت بڑی ترقی ظاہر کی ترکی ایک محدود رقبہ میں بولی جاتی ہے اور ترکی بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں اُسکے مقابلہ میں اُردو کا قلمرو بہت زیادہ وسیع ہے اور دس کروڑ کی تعداد اُردو بولنے والوں کی ہے - اسی طرح خدا کے فضل و کرم سے ترکی کو سیکڑوں برس سے سلاطین عثمانیہ کے زیر سایہ ترقی کرنیکا موقع ملتا آتا ہے - لیکن اُردو نے شاہجہاں کے وقت میں سر نکالا اور اُسوقت سے ابتک اس کو بادشاہی حمایت کا موقع نہیں ملا - کیونکہ پہلے فارسی غالب تھی پھر انگریزی کا دور دورہ ہوا - بایں ہمہ اس نے خود اپنی نشو و نما کی خودرو طاقتوں سے ایسی ترقی حاصل کی جو بہت کچھ قابل قدر ہے -

اور جیسے ترکی کی شاعری اور ادب میں پہلے فرنچ کی روشنی نمایاں ہوئی

اور اب جرمن کے برقی لیمپ شاعرانہ دماغ کو روشن کر رہے ہیں ویسی ہی اُردو کو انگریزی لیمپوں کی تابناک روشنیوں نے بہت کچھ روشن کر دیا ہے اور انگریزی کے علاوہ ہر قسم کے مغربی خیالات و مقاصد کے اثر سے اُردو کی شاعری اور لٹریچر میں مفید تحریک کے ساتھ لطافت خیال اور سلاست مقال کو نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے اور ہندوستان کے اہل مطالع اور شاعر اور ادیب اور مترجم اردو کے خزانۂ ادب میں ہر قسم کے جواہر جمع کرنے میں مصروف ہیں۔

اسی طرح ترکی کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعروں کے سامنے اردو کے غزل اور قصیدہ کہنے والے شاعر پیش کئے جاسکتے ہیں جو کسی بات میں اُن سے کم نہیں۔ اور انواع بزم و رزم اور رقت انگیزی و رجز نگاری کا مقابلہ میر انیس و میرزا دبیر کے کلام اور مراثی و سلام سے ہو سکتا ہے اور دونوں کے دلنشین اثرات میں اکثر مقامات پر اُردو بازی لیجا سکتی ہے۔

ترکی میں مرثیہ لکھنے کا مذاق بہت کم ہے۔ پھر بھی ترکی زبان میں جو مرثئے کسی بڑے نامور شخص کی تعزیت اور یادگار میں لکھے گئے ہیں وہ وہی عربی اور فارسی کے محدود طرز کلام کا نمونہ ہیں جس میں چند شعروں سے زیادہ ترکی نے اپنا زور کلام دکھانے کو کوئی وسیع جادہ پیدا نہیں کیا اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور میرزا دبیر جو کام کر گئے وہ خود انکے معنی آفریں طبیعتوں کا پیدا کیا ہوا ادب ہے جس کی مثال عربی فارسی ترکی کسی زبان میں نہیں ملتی اور ترکی نے کوئی ترقی

ایسی نہیں کی جس سے میر انیس اور میرزا دبیر کی شاعری مقابلہ نہ کر سکے یا وہ زور کلام اردو کے دوسرے سخن طرازوں کی تصنیف میں نہ پایا جاوے۔

۱۳ عنقا

(عبد الحلیم شرر)

عبد الحلیم شرر سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انکے آباو اجداد جو شیخ تھے، ہرات و عراق ہوتے ہوئے، عرب سے ہندوستان میں آئے اور یہاں بھی ہمیشہ معزز رہے۔ ان کے نانا قمر الدین، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ، شاہان اودھ کے یہاں ملازم رہے اور الحاق اودھ کے بعد آخر الذکر کی والدہ کے ساتھ انگلستان بھی گئے۔ انکے والد کا نام تفضل حسین تھا چنانچہ سنہ ۱۸۶۲ء میں یہ کلکتہ چلے گئے اور وہاں پہنچکر مٹیا برج پر واجد علی شاہ کے ساتھ رہے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں شرر بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج کے علما کی صحبت سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ دس سال تک مرزا محمد علی، مرزا کاظم بخش اور مرزا محمد جلال کی معیت میں بسر کی۔ اس صحبت میں شرر کا روزمرہ درست ہو گیا اور انہوں نے صحیح محاورات بھی سیکھ لیے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی حد تک انکی تربیت ذوق بھی ہو گئی مگر وہاں کی زندگی نے انہیں عیش و عشرت کا خوگر بنا دیا جس نے انہیں نقصان پہنچایا۔ قمر الدین کی دستکشی کے بعد سنہ ۱۸۷۵ء

میں یہ انکی جگہ مقرر ہو گئے مگر عہدے کے فرائض نے انکے مطالعہ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ کلکتہ کی فضا سے دور رکھنے کے لئے انکے والد نے انہیں لکھنؤ واپس کر دیا۔ لکھنؤ میں ان کے اکتسابات جاری رہے۔ اور اسی سلسلے میں انہیں دہلی بھی جانا پڑا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں انہیں ملازمت کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ مطبع نولکشور رہیں اودھ پنچ اخبار کی نائب ایڈیٹری انہیں مل گئی۔ یہ تقرر شرر کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کئے جو بہت پسند کئے جانے لگے اس زمانہ میں انکی شہرت اور استعداد دونوں بڑھتی رہیں اور رفتہ رفتہ انہیں صحافت کا اچھا خاصہ تجربہ ہو گیا اسی زمانہ میں ان کا مضمون جو روح کے متعلق تھا سرسید جیسے آدمی نے بہت پسند کیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں انہوں نے سب سے پہلے ایک ہفتہ وار اخبار محشر جاری کیا مگر دو سال بعد اسے بند کرنا پڑا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے دلگداز جاری کیا۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں کچھ مالی دشواریوں کے باعث شرر حیدرآباد چلے گئے اور دلگداز بند کرنا پڑا۔ تاریخ سندھ لکھنے پر نواب وقارالامراوزیراعظم نے حیدرآباد کے خزانۂ عامرہ سے انہیں پانچ ہزار روپیہ انعام دلایا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں دلگداز لکھنؤ سے پھر جاری کر دیا مگر شرر کے انگلستان چلے جانے پر پھر بند ہو گیا۔ انگلستان میں شرر نے انگریزی اور تھوڑی سی فرانسیسی زبان پڑھی۔ اور سنہ ۱۸۹۶ء میں ہندوستان واپس آئے۔ اسی سال پھر دلگداز حیدرآباد سے نکلنا شروع ہو گیا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں شرر وقارالامرا کی اجازت سے لکھنؤ چلے آئے۔ اور انکے ساتھ دلگداز بھی یہاں آگیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں شرر کو پھر حیدرآباد بلا کر نائب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مقرر کر دیا گیا۔ مگر سنہ ۱۹۰۹ء میں نظام کے

حکم سے انہیں حیدرآباد چھوڑ دینا پڑا۔ اسکے بعد انکے علمی مشاغل برابر جاری رہے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔

شرر کی زندگی بہت سے دلچسپ واقعات کا ایک مجموعہ ہے اور انکی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہیں فن صحافت میں کمال حاصل تھا۔ انکی دوسری خصوصیت ان کا زور قلم ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بالکل ایک سی قدرت کے ساتھ لکھا ہے اور یہ اسی قدرت کا نتیجہ ہے کہ وہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے باکمال ادیب اور انشاپرداز پیدا ہوئے ہیں مگر شرر کے برابر جلد لکھنے والا دوسرا نہیں۔ شرر مختلف خصوصیات کا مجموعہ تھے اس لئے ہم انہیں ایک ہی وقت میں ناول نویس، مورخ، مضمون نگار، نقاد، ادیب، مصلح، ماہر صحافت، ڈراما نگار، ماہر تعلیمات اور بعض اوقات ماہر سیاست بھی کہہ سکتے ہیں۔ ناول نویسی کے ذیل میں یہ ماننا پڑیگا کہ شرر نے اردو میں تاریخی ناول کی بنیاد ڈالی، مگر کئی وجوہ کی بنا پر انکے ناولوں کو آرٹ کے نمونے نہیں کہا جاسکتا۔ شرر نے اپنے ناول نہایت عجلت میں جو حیرت انگیز حد تک پہنچی ہے، لکھے ہیں۔ اس لئے ان میں بعض ایسے نمایاں معائب باقی رہ گئے ہیں جو محنت اور غور کرکے لکھنے سے دور ہو سکتے تھے۔ شرر کے ناولوں میں مختلف ممالک کا ذکر ہے۔ مگر وہاں کے تمدن، معاشرت، اخلاق و آداب کے اذکار کا پتہ نہیں۔ ان باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شرر کا مطالعہ اس ذیل میں بہت کم تھا ورنہ ہر ناولوں میں عہد و مقام کے خصوصیات کا ہونا لازمی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ شرر کے ناول تاریخی محض نام کیلئے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کسی خاص عہد سے متعلق صرف اس لئے معلوم ہوتے ہیں کہ مصنف خود

بتا دیتا ہے کہ اس کا قصہ فلاں زمانہ کا ہے۔ نفس قصہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہوتی جو خود بتائے کہ مصنف فلاں زمانہ کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ شرر کے ناولوں میں صرف بیانات پر اکتفا کیا گیا ہے زمانہ کی اصل تصویریں پیش نہیں کی گئیں اور بالکل یہی حال لوکل کلر کا ہے۔ جس طرح زمانہ کی تصویریں ناپید ہیں اسی طرح مقامات و ممالک کے مناظر مفقود ہیں۔

تاریخی ناولوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو سوسائٹی کے متعلق جو ناول ہیں ان میں بھی کوئی خصوصیات نظر نہیں آتیں۔ سب کے قصے اور ہیرو قریب قریب ایک ہی قسم کے ہیں، اور محبت کی جو قسم پیش کی گئی ہے وہ بھی کچھ اونچے درجہ کی نہیں ہاں واقعات و حوادث میں کہیں کہیں فرق ضرور نظر آتا ہے مگر کیریکٹر ہر جگہ ایک ہی سے ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ کیریکٹر نگاری کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ زبان ہر جگہ بالکل ایک سی ہے یہاں تک کہ مکالموں میں بھی وہی لکھی جاتی ہے جو اصل بیان میں ہوتی ہے اور اس سے واقعات کی اصلیت مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیائے صحافت میں شرر کا مرتبہ بہت بلند۔ اور ایک نقاد کی حیثیت سے بھی کسی طرح کم نہیں مگر بعض اوقات وہ تعصب اور ضد سے کام لینے لگتے ہیں۔ جیسا کہ گلزار نسیم کے معاملہ میں انہوں نے کیا۔ اردو زبان پر شرر کا بڑا احسان ہے۔ انہیں اردو میں تاریخی ناول کا ہراول کہنا بیجا نہیں۔ اردو میں ان کا وہی درجہ ہے جو انگریزی میں سر والٹر اسکاٹ کا۔ انہوں نے اردو ناول کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا اور اُسے ایک ادبی شان بخشدی جو اس سے پہلے اردو میں ناپید تھی۔ باوجود اپنے معائب کے شرر کا شمار صفِ اول کے انشا پردازوں میں ہے۔

تصانیف۔ درگیش نندنی، منصور موہنا، شوقین ملکہ، یوسف ونجمہ، بدرالنساکی مصیبت، فلورافلورنڈا، ملک العزیز ورجنا، حسن انجلینا، فردوس بریں، ماہ ملک، عجیب وال دلہن، عزیزہ مصر، دلکش، دلچسپ، طاہرہ، مینا بازار، لعبت چین۔ فلپانا، دربار حرام پور، بابک خرمی، ولادت سرور عالم، ثانی اثنین، ذی النورین، ابوالحسنین، سکینہ بنت حسینؓ، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، خواجہ معین الدین چشتی، افسانۂ قیس، ملکہ زنوبیہ، حسن بن صباح، قیس ولبنیٰ، مقدس نازنین، ایام عرب، فتح اندلس، شہید وفا، حسن کا ڈاکو، زوال بغداد، تذکرہ مشاہیر عالم، وغیرہ وغیرہ۔

ذیل کا مضمون اُنکے ایک مضمون عنقا سے ماخوذ ہے۔

ہر قوم اور ہر ملک کی تاریخ کا ابتدائی اور افتتاحی زمانہ اسکی دیومالا سمجھا جاتا ہے جس میں عموماً ایسی باتیں ہوتی ہیں جو بعید از عقل اور انسان کے بچپن کے خیالات واوہام کا نمونہ ہوتی ہیں، ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم کی دیومالا میں اس قسم کا کوئی نہ کوئی جانور ضرور بیان کیا گیا ہے، ابتدا اگرچہ اُسے دیوتاؤں کی ایسی وقعت دی گئی، بعد والوں نے اُسکے وجود سے انکار تو نہیں کیا مگر اس کے طرح طرح کے حالات بیان کئے اور کہا کہ وہ اُن مقامات میں رہتا ہے جہاں انسان کا گزر نہیں ہوتا۔ لیکن جب کہ محققین اور خاصۃً علم حیوانات کے ماہرین نے ساری دنیا چھان ڈالی تو سب کو تسلیم کر لینا پڑا کہ وہ محض ایک خیالی چڑیا ہے، جسے خدا نہیں بلکہ قدما کے وہم وگمان نے پیدا کیا تھا۔ غور طلب یہ ہے کہ عنقا کا خیال اصل میں عربوں ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے یا اسے انہوں نے

کسی قسم سے اخذ کیا، اگر خود لفظ کو دیکھا جائے تو "عنقا" کا لفظ خالص عربی ہے اور کسی عجمی زبان سے نہیں لیا گیا ہے، عربی میں "عنق" گردن کو کہتے ہیں۔ اور حیواۃ الحیوان میں دمیری شافعی نے عنقا کی وجہ تسمیہ دو باتیں بتائی ہیں، ایک یہ کہ عربوں کے خیال کے مطابق اس عظیم الشان اور خیالی طائر کے گلے میں ایک سفید طوق سا بنا ہوا ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ اس کی گردن بہت لمبی ہوتی ہے غرض انہی دونوں میں سے کسی خیال کی بنیاد پر اس کا نام عنقا قرار دیا گیا۔

لیکن یہ صرف نام کی بنا پر ہے ورنہ یہ خیال اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی طائر ہر قوم کی دیومالا میں موجود ہے قدیم مصریوں نے اس قسم کے ایک خیالی طائر کی تصویریں اپنی عمارتوں پر بنائی اور اس کی بڑی عظیم الشان مورتیں تراشی تھیں جس کا سر کہیں آدمی کا سا، کہیں مینڈھے کا سا اور کہیں عقاب کا سا بنایا تھا، دھڑ شیر کا اور اس میں عقاب کے ایسے زبردست بازو لگائے گئے

اسی طرح "نسروس" نام ایک طائر کی صورت اہل بابل کی دیومالا میں تھی جسے وہ اپنا ایک زبردست دیوتا خیال کرتے تھے، ان کے مذاق میں نسروس کا دھڑ آدمی کا تھا اور چونچ اور پر عقاب کے ایسے تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کے عقائد میں بھی اس قسم کا ایک مجتمع الاضداد طائر موجود تھا جسے وہ "گرفون" کہتے تھے، اس کا دھڑ شیر کا اور چونچ اور بازو عقاب کے تھے۔ ہندوؤں کے اعتقاد میں بھی اس قسم کا ایک زبردست طائر موجود ہے جسے وہ "گرڑ"

سکتے ہیں۔ انکی دیو مالا میں اگرچہ اس طائر کے متعلق چوپایوں یا انسان کا دھڑ تو ہمیں
تجویز کیا گیا مگر صرف عظمت و قوت کے لحاظ سے اسے بہت کچھ ترقی دی گئی بتایا
گیا کہ سری کرشن جی مع تمام خاندان کے اس پر سوار ہو کر سیر کرتے تھے اور مہابھارت
کے نامور سورما اسی پہ سوار ہو کے میدان رزم میں آئے تھے۔ اسکے ساتھ اسکا
یہ بھی روحانی کمال بتایا گیا کہ اڑتے وقت اس کے پروں میں سے مقدس وید
کے اشلوک سنے جاتے ہیں۔ ایرانیوں میں بھی "سیمرغ" موجود تھا جس نے رستم کے
باپ زال کی پرورش کی تھی اور وقتاً فوقتاً رستم کی مدد کو بھی آیا کرتا تھا۔ اس بات کا پتہ
لگانا مشکل ہے کہ عربوں میں اس وہمی طائر کا خیال کس قوم سے آیا۔ ظہور اسلام
سے پیشتر ان کا تمدن تین قوموں کے خیالات کا مجموعہ تھا اوّل عرب
عاربہ آل قحطان کہلاتے تھے اور جن کا اصلی وطن ملک یمن تھا۔ اور دراصل یہی
لوگ اصلی عرب تھے۔ دوسرے یہود جو حضرت اسمٰعیلؑ کے ہی زمانہ سے یہاں
آنا شروع ہو گئے جن سے اور قحطانیوں کے امتزاج سے ایک نئی نسل
پیدا ہوئی جو عرب مستعربہ کے نام سے مشہور تھی اور اس گروہ کے قائم ہو جانیکے
بعد بھی موسوی آداب و تمدن کا بہت کچھ اثر عربوں پر پڑا ہوا تھا اور تیسرے
ایرانی جو قدیم الایام سے اہل عرب کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے اور جن سے
پیشتر انہی کے ملک میں سے صابئین جو حقیقتہً قدیم بابلی مذہب کے پیرو
تھے سارے عرب میں پھیل چکے تھے۔ ایرانیوں اور صائبین میں کسی ایسے طائر

کا خیال موجود ہونا خود ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یہود کے مسلمات میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا طائر ضرور موجود ہوگا، اس لئے کہ گو انکی کتابوں میں ڈھونڈھنے کی ہمیں نوبت نہیں آئی مگر عربی کہانیاں جو اسرائیلی روایتوں سے ماخوذ ہیں اسکی شہادت دے رہی ہیں۔ باقی رہے اصلی عرب اور قحطانی، اُنکے زمانہ کی کوئی کتاب یا تحریر موجود نہیں ہے مگر زیادہ تر قیاس اسی طرف جاتا ہے کہ عربوں میں عنقا کا خیال انہیں لوگوں سے شروع ہوا، اس لئے کہ عنقا کے جتنے خالص عربی قصے کتب عربیہ میں نقل کئے گئے ہیں سب ملک یمن اور صنعا ہی سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اتنی تاریخی تنقید کے بعد اب ہمیں بتانا چاہئے کہ اہل عرب کے نزدیک عنقا کیا چیز ہے؟ اسکی صورت کیسی ہے؟ اور وہ کب اور کہاں پایا گیا؟ ربیع الابرار سے صاحب حیواۃ الحیوان نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے جو یقیناً بنی اسرائیل کی روایتوں اور کہانیوں سے ماخوذ ہے کہ "اللہ جل شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک چڑیا پیدا کی جس کا نام عنقا تھا، اسکے جسم میں چاروں طرف چار بازو تھے، چہرہ آدمی کا سا تھا اور خدا نے اُسے ہر چیز میں سے کچھ کچھ حصہ ضرور عطا فرمایا تھا اور اس کے لئے اسی کا سا ایک نر بھی پیدا کیا، پھر جناب موسیٰ پر وحی نازل کی کہ میں نے دو عجیب وغریب چڑیاں پیدا کی ہیں اور انکا رزق ان وحشی جانوروں کو قرار دیا ہے جو بیت المقدس کے گرد رہتے ہیں۔ اسکے بعد اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی مگر

جب حضرت موسیٰ کا انتقال ہوگیا تو یہ طیور ارض فلسطین چھوڑ کے نجد میں چلے آئے جہاں وحشی درندوں کو کھاتے اور بچوں کو اٹھا لیجاتے تھے یہاں تک کہ حضرت رب العزت نے بنی عبس میں سے خالد بن سنان عبسی کو پیغمبر بنا کے مبعوث کیا لوگوں نے انکی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی تو انہوں نے درگاہ خداوندی میں دعا کی جس کا یہ اثر ہوا کہ اُس طائر کی نسل ہی فنا ہوگئی۔"

یہ تو وہ روایت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عنقار کا خیال اہل عرب میں بنی اسرائیل سے آیا مگر دوسری روایتیں جن سے اس طائر کا وجود عرب عاربہ اور بنی قحطان یمن میں ثابت ہوتا ہے عربوں میں زیادہ مشہور ہیں اور ان روایتوں کے ذریعہ سے قوم "رس" کے زمانہ میں اس طائر کا ظاہر ہونا بتایا جاتا ہے۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ قوم رس کا مرکز شہر عدن تھا اور جو قوم وہاں آباد تھی وہ قوم "ثمود" کی باقی ماندہ یادگاروں میں تھی، انہی لوگوں کے زمانہ میں عدن والوں کے لئے پانی کے وہ قابل حیرت عظیم الشان حوض اور کنوئیں بنائے گئے جو آج تک موجود ہیں۔ اور جن میں بارش کا پانی پہاڑوں سے اُتر کر جمع ہوتا اور برس بھر تک اہل شہر اور دیگر مخلوق کے لئے کافی ہوتا ہے اسی سرزمین اور اسی مذکورہ قوم کے زمانہ میں علامہ عکبری طائر عنقار کا ظہور بتاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے علاقہ میں ایک پہاڑ تھا جو "مخ" کہلاتا تھا اور اسکی چوٹی زمین سے ایک میل اونچی تھی (غالباً اُس سے وہ مقام مراد ہے جہاں آجکل شہر مخا آباد ہے) اس مقام پر انواع واقسام

کے طیور رہا کرتے تھے جن میں عنقا بھی تھا۔ یہ بہت ہی بڑا قوی ہیکل
چہرہ آدمی کا سا تھا اور دنیا میں جتنے جاندار ہیں ان سب کی اس میں
کوئی چیز ضرور موجود تھی، باوجود اس عظمت کے یہ نہایت خوبصورت چڑیا تھی اور
اس پہاڑ پر ہر سال ایک مرتبہ آیا کرتی تھی اور اس کے تمام طیور کا شکار کر لیا کرتی
تھی۔ ایک سال یہ اتفاق پیش آیا کہ پہاڑ کی چڑیاں اس کے لئے کافی نہ ہوئیں اور
بھوک نے ستایا تو انسانوں کی طرف متوجہ ہوئی، پہلے ایک لڑکے کو جھپٹ
لیگئی، پھر ایک لڑکی کو اٹھا لیگئی، ان دنوں حضرت خنظلہ بن صفوان علیہ السلام
موجود تھے جو قوم رس پر مبعوث ہوئے تھے، لوگوں نے انکی خدمت میں جاکر
شکایت کی خنظلہ نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی جس کی مقبولیت یوں ظاہر
ہوئی کہ عنقا پر بجلی گری وہ جل بھن کر خاک ہوگئی۔"

اسی مضمون کو تھوڑے اختلاف کے ساتھ علامہ قزوینی نے عجائب المخلوقات
میں بھی بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "عنقا سب سے بڑا طائر ہے۔ ہاتھی کو
اس طرح اپنے پنجہ میں اٹھا لیجاتا ہے جس طرح کہ چیل چوہے کو اٹھا لیجاتی ہے۔
اگلے دنوں یہ چڑیا آدمیوں میں رہتی تھی جنھیں اس سے اذیت پہنچنے لگی۔
یہاں تک کہ ایک دن وہ ایک دلہن کو جبکہ وہ زیور سے آراستہ بیٹھی ہوئی تھی
اٹھا لیگئی۔ یہ حالت دیکھ کے حضرت خنظلہ نبی نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور خدا نے اسے
وہاں سے اڑا کے بحر اعظم کے کسی جزیرے میں پہنچا دیا جو خط استوا کے اس پار ہے

آدمیوں کا وہاں تک گذر نہیں ہوتا اور بڑے بڑے وحشی جانور اور درندے وہاں کثرت سے ہیں جن کو شکار کر کے وہ اپنی زندگی بسر کرتی ہے عنقا جس وقت اُڑتا ہے تو اسکے پروں سے گرج اور پانی کے دھڑ دھڑا کے گرنے کی سی آواز نکلتی ہے اسکی عمر دو ہزار برس کی ہوتی ہے اور پانچسو برس کا پٹھا بالغ ہوتا اور انڈے دیتا ہے۔ اور انڈا دینے کے وقت اُسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ عرب لوگ عنقا کو عنقاء مغرب کہتے ہیں جسکی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں اس کا اصلی وطن سرزمین مغرب ہے۔

یونانیوں میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس قسم کا ایک طائر مشہور ہے جو گرفون کہلاتا ہے، غالباً اس کا حال ارسطو نے اپنی ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس سے عربی مصنفین کو اپنے خیال کی تصدیق ہوگئی، اور ان واقعات کو انہوں نے عنقاء کے تذکرے میں نقل کر لیا۔ ارسطو طالیس نے سب سے بڑھ کے یہ کمال کیا ہے کہ کہتا ہے "اس طائر کا شکار بھی کیا جاتا ہے اور اسکے پنجوں سے پانی پینے کے نہایت نفیس اور بڑے بڑے کاسے بنائے جاتے ہیں" پھر خود ہی اس کے شکار کی یہ تدبیر بتاتا ہے کہ "لوگ لا کے دو بڑے بڑے بیل کھڑے کرتے ہیں اور انکے درمیان میں ایک بڑا بھاری تھیلا رکھتے ہیں جو دونوں جانب اُن میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے اندر بڑے بڑے وزنی پتھر بھر دیے جاتے ہیں جن کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس تھیلے کے

سامنے ایک کوٹھری بنائی جاتی ہے جس میں کوئی آدمی بیٹھ کر چھپ رہتا ہے اور وہ اپنے پاس آگ تیار رکھتا ہے عنقار اوپر سے گرتا ہے کہ ان بیلوں کو جھپٹا مار کے اڑا لیجائے مگر وہ بیل ان پتھروں کی وجہ سے نہیں اٹھ سکتے اور اسکے پنجے ان کے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں، یہ دیکھتے ہی آدمی کوٹھری سے آگ لئے ہوئے نکلتا ہے اور اسکے پروں میں آگ لگا دیتا ہے" ارسطو اس جانور کا حلیہ یہ بتاتا ہے کہ "اس کا پیٹ بیل کے پیٹ کے مثل ہوتا ہے اور ہڈیاں درندوں کی ایسی ہوتی ہیں"

ارسطو نے تو اس کے شکار ہی کی تدبیر بتائی تھی، مسلمان مصنفین میں سے بعض بزرگوں نے اسے دیکھا بھی تھا چنانچہ علامہ ابن خلکان کہتے ہیں احمد بن عبد اللہ بن احمد فرغانی نے (جو ارض مصر میں آکے اقامت پذیر ہو گئے تھے) اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "خلفائے بنی فاطمہ مصر کے خاندان والوں میں عزیز بن نزار بن معز نے اپنے یہاں طرح طرح کے زندہ جانوروں کا ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا جس میں ایسے ایسے عجیب جانور لا کے جمع کئے گئے تھے جیسے کہ شاید اس سے پیشتر کبھی نہ جمع کئے گئے ہونگے۔ ان ہی میں عنقار بھی تھا جو بلندئ مصر کے علاقوں سے لایا گیا تھا"

عربوں میں اسی حیثیت و شان کا ایک جانور "رخ" کے نام سے بھی مشہور ہے جس کا الف لیلہ میں ذکر آیا ہے اور شاید وہ الف لیلہ ہی کی ایسی

کہانیاں تھیں جن سے اخذ کرکے اسکے حالات عجائب المخلوقات اور حیواۃ الحیوان میں درج کر دیے گئے ہیں۔ مگر اب عنقار، سیمرغ، اور رخ ان تینوں ناموں کا مفہوم ایک ہی خیال کیا جاتا ہے۔ جو گولر کے پھول کی یا کسی ایسی چیز کے مترادف ہے جس کا وجود صرف خیالات میں ہو اور ظاہری و مادّی دنیا میں اس کا کبھی پایا جانا نہ ثابت ہوتا ہو۔

تخلیق عالم اور نیچرل ہسٹری کے موجودہ محققین کی رائے اب یہ قائم ہوتی جاتی ہے کہ انسان کی پیدائش سے پیشتر اور اسکے ابتدائی دور میں کرۂ زمین ایسے ایسے عظیم الشان، عجیب و غریب اور خوفناک پرندوں، چوپایوں اور چھپکلی کے ایسے جانوروں سے بھرا ہوا تھا جن کی نسلیں باہمی لڑائیوں اور خلقت کی کشمکش سے فنا ہوگئیں۔ ان میں سے بعض کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی برفستانی مقامات میں پڑے مل گئے جو دنیا کے بڑے عجائب خانوں میں لاکے رکھے گئے ہیں، ممکن ہے کہ اس قسم کی کوئی چڑیا اس زمانہ میں اور نوع انسانی کے بچپن میں موجود ہو جس میں وہ پوری شان پائی جاتی ہو جو عنقار یا رخ یا سیمرغ کی بتائی گئی ہے، فی الحال انسان نے زمین کے ہر ہر کونے کو چھان ڈالا اور ایسے کسی طایر کا کہیں پتہ نہیں لگا، لہذا تجربہ اور مشاہدہ ہمیں بھی کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عنقار خارج میں نہیں بلکہ صرف ہمارے ذہن اور ہمارے خیال میں ہے۔"

ہم ان خیالات پر حسب ذیل معلومات کا اضافہ کرتے ہیں جو یقین ہے کہ ناظرین نقاد دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ہیروڈوٹس (Herodotus) لکھتا ہے کہ میں نے عنقا کی ایک تصویر مصر میں دیکھی تھی اور وہاں اہل ہلیو پولس (Heliopolis) کی زبانی سنا تھا کہ عنقا اپنے باپ کے مرنے پر پانچسو برس کے بعد عرب سے آیا کرتا ہے اور اپنے باپ کی مومیائی شدہ لاش کو مُر (Myrrh) کے گولے میں لایا کرتا اور سورج کے مندر میں دفن کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس اس قصہ کو خود نہیں مانتا مگر کہتا ہے کہ اس جانور کی تصویر میں سرخ اور سنہری پر تھے اور یہ تصویر قد و قامت اور صورت میں عقاب سے زیادہ مشابہ تھی۔ عنقا کا قصہ اور مصنفین نے بھی کچھ تغیر و تبدل کے ساتھ لکھا ہے اور اہل رومتہ الکبریٰ کو یہ قصہ بہت عزیز تھا چنانچہ پلینی (Pliny) کہتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی عنقا ہوتا ہے جو اپنی عمر دراز کے خاتمہ پر اپنے واسطے تیج پات اور لوبان کی شاخوں سے نشیمن بناتا ہے اور اسی میں مرجاتا ہے۔ اسکی لاش میں سے ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جو بڑھکر عنقا ہوجاتا ہے اور بقول ٹیسی ٹس (Tacitas) یہ عنقا خورد اپنے مردہ باپ کو سورج کے شہر کی قربانگاہ پر رکھ کر جلاتا ہے۔ اسکی پیدایش اور موت کے مختلف قصے اور بھی مشہور ہیں چنانچہ ہوراپولو (Horapolla) بیان کرتا ہے کہ عنقا اپنے آپ کو زمین پر گرا دیتا ہے اور زخمی ہوجاتا ہے۔ اس زخم

کے آئیکر (Ichor) سے نیا عنقار پیدا ہوتا ہے عوام الناس میں اس قصہ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے اور یہ قصہ فزیولوجس

(Physiologus) میں اس طرح درج ہے۔

عنقار ایک ہندوستان کا پرندہ ہے جو پانچسو برس ہوا کھا کر زندہ رہتا ہے اور اس مدت کے بعد وہ اپنے پروں میں مصالح لاد کر شہر ہلیوپولس چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر مندر میں داخل ہوتا ہے اور قربانگاہ پر جل کر خاک ہو جاتا ہے ، دوسرے دن اس کی خاک سے عنقار خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور تیسرے روز اسکے پر مکمل ہو جاتے ہیں اور وہاں کے پجاری کو سلام کرکے اُڑ جاتا ہے۔ اسکی عمر کا زمانہ بھی مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بعض مصنفین نے ۱۴۶۱ برس اور بعض نے ۷۰۰ برس تک لکھے ہیں لیکن ۵۰۰ برس کو عمومیت حاصل ہے

ٹیسی ٹس کہتا ہے کہ یہ پرند پہلی مرتبہ سیسوسٹرس (Sesostris) کے عہد میں ، پھر اماسس (Amasis) کے عہد میں اور اس کے بعد بطلیموس ثالث (Ptolemy III) کے عہد میں اور ایک مرتبہ ۳۴ء میں اتنی جلدی پیدا ہوا تھا کہ اسکے اصلی عنقار ہونے میں بھی شبہ تھا۔ اور وہ عنقار جو رومتہ الکبریٰ میں ۴۷ء میں دکھایا گیا تھا اس کو سب لوگ ایک مصنوعی ڈھونگ سمجھتے تھے۔

ان قصوں کو عوام کے مسرت گذرت افسانے سمجھا جاتا تھا اور خرد مند

نہ خیال کیا جاتا تھا لیکن مصر کے پراسرار مذہب کی بہت سی باتیں ان قصوں میں شامل ضرور تھیں۔ ہوراپولو اور ٹیسی ٹس عنقا کو سورج کی ایک مفروضہ نشانی بتاتے ہیں۔ کتاب الممات اور دیگر مصری کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ ایک پرند جس کو بنّو (Bennu) کہتے تھے ہلیوپولس کی پرستش کی علامت تھا اور وائڈمین (Wideman) نے اسکو واضح کر دیا ہے کہ بنّو طلوع ہوتے ہوئے سورج کی علامت تھا اور اسی سبب سے اسکی نسبت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ خود پیدا ہو جاتا ہے اور اس کو رع (Ra) کی روح اور شمس جلیہ کا دل کہتے تھے۔

صبح کو سورج کی تمام پُراسرار علامتیں اور اصول حیات بعد ممات کے متعلقات بنّو سے منسوب کر دئے گئے۔ مصریوں کے بھجنوں کی زبان (جس میں اہل مصر درخشندہ صباح کو عرب سے آتا ہوا دیکھ کر تعریف کیا کرتے تھے جب وہ تمام دیوتاؤں کو اپنی خوشبو سے مست کرتا ہوا صبح کی روشنی کے ڈوبتے ہوئے شعلوں میں سے نکل کر آتا تھا) ان خصوصیات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے کافی تھی جنھوں نے عنقا کی قدیم تصاویر میں مادی صورت اختیار کر لی تھی۔

(Phenix) عنقا کا اصل (Bennu) یعنی اصل بنّو کا چربہ فینکس تھا اور اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصری زبان میں بنّو کے

معنی کھجور کے درخت کے ہیں اور یونانی زبان میں فنیکس کے معنی بھی یہی ہیں۔
عہد عتیق کی یادگاریں عنقار کا ذکر ایک معمولی پرندہ کی حیثیت سے آیا ہے، وہ کوئی عجیب الخلقت وعظیم الشان وجود تسلیم نہیں کیا گیا اور نہ اسکے اس قدر عرصہ کے بعد نمودار ہونے کا کچھ ذکر ہے۔ مختلف روایتوں سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسکی زندگی کے تمام افسانے فرضی اور قیاسی ہیں۔ پرانی مصور رسم الخط میں جو تصویر بنّو کی بنی ہوئی ہے وہ دراصل بگلے کی ہے اور اس لئے عنقار کا جو رنگ وروپ بتایا گیا ہے وہ اس کے مماثل نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مصری کتابوں میں بنّو محض ایک علامت ہے جس کو اصلی پرندہ سے صرف تعلق موہوم ہے۔ ہیروڈوٹس نے عنقار کے جو سنہری اور سرخ رنگ بیان کئے ہیں وہ غالباً طلوع آفتاب کے رنگ ہیں مگر ہیروڈوٹس نے جو عنقار کو عقاب کی مانند بیان کیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ خیال اس نے کیونکر قائم کیا؟ غالباً یہ حافظہ کی غلطی ہوگی۔

بائیبل میں جو لفظ خول (Chol) آیا ہے اسکی نسبت بھی یہی خیال کیا گیا ہے کہ عنقار کا ذکر ہے عربوں میں سلمندر (Salamanders) اور عنقاء کا قصہ غلط ملط ہو گیا ہے اور اس کو کبھی چوپایہ کی صورت میں بتایا جاتا ہے اور کبھی پرند کی صورت میں مگر اس کی ہستی متیقن ہے۔ قدیم الایام میں ایک قسم کے کیڑے ہوتے تھے جو آگ سے نہ جلتے تھے، ان کی نسبت

خیال کیا جاتا تھا کہ یہ اسی کے بالوں یا پروں کے بنے ہوئے ہیں اور کپڑے کا نام بھی اسی کے نام پر تھا۔

زبان فارسی میں سیمرغ کا قصہ اور الف لیلہ میں رُخ کا قصہ عنقار کے مندرجہ بالا قصوں سے بہت کچھ مقتبس ہے۔ اور (علامہ) قزوینی کے بیان کے مطابق عنقار ۱۷۰۰ سال تک زندہ رہتا ہے اور جب بچہ انڈے سے نکلتا ہے تو مادہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کا باپ جل کر اس کیلئے نر بن جاتا ہے اور نر پیدا ہونے کی حالت میں اسکی ماں جل کر اس کے لئے مادہ بن جاتی ہے۔ کلیلہ دمنہ میں سیمرغ یا عنقار کو جو شاہ مرغان بتایا گیا ہے وہ ہی درجہ ہندوستان کا گدھ رکھتا ہے جس پر وشنو مہاراج سواری لیا کرتے ہیں۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

الغرض یہ ہے وہ عنقا جس کا نام تو سب جانتے تھے مگر صورت اور حالات سے ناآشنا تھے اب بھی اگرچہ عنقا نہ ملا مگر یہی کیا کم ہے کہ اسکی صورت آپ نے دیکھ لی اور حالات معلوم ہو گئے۔

(۱۴) ضعیف الاعتقادی

(پنڈت رتن ناتھ سرشار)

(پنڈت رتن ناتھ سرشار انیسویں صدی کے آخری حصہ میں، ایک نہایت مشہور اور ممتاز انشاپرداز تھے۔ یہ ایک معزز کشمیری خاندان میں بمقام لکھنؤ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ انکی عمر صرف چار سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ سرشار نے ضلع اسکول کی مدرسی سے اپنی زندگی شروع کی اور وہاں سے مراسلۂ کشمیری اور اودھ پنچ میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ ان مضامین میں کوئی خصوصیت نہیں مگران سے آیندہ کے لئے ان کی تربیت ذوق ہو گئی۔ سرشار کو ترجمہ کرنے میں بھی بڑا ملکہ تھا۔ چنانچہ انکے ترجمے نہایت پسند کیے جاتے تھے۔ اور ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے بھی انکے محاسن کا اعتراف کر لیا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں انہیں اودھ اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اب انہوں نے فسانۂ آزاد لکھنا اور اودھ اخبار میں بہ اقساط شائع کرنا شروع کیا۔ ۱۸۸۰ء میں فسانۂ آزاد کتابی صورت میں شائع ہوا اور بہت کافی تعداد میں فروخت ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں سرشار حیدرآباد چلے گئے وہاں ان کی بڑی عزت کی گئی۔ آخر زمانہ میں انکی شراب نوشی بہت بڑھ گئی اور یہی ان کی ناوقت موت کا سبب ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۰۳ء میں بمقام حیدرآباد انتقال کیا۔ سرشار ایک نغزگو شاعر اور اسیر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۹۷ء میں انہوں نے کشمیری کانفرنس کے لئے ایک قصیدہ لکھا۔ اس کے علاوہ

وہ مثنوی "تحفۂ سرشار" کے بھی مصنف ہیں۔

سرشار اس قسم کے لوگوں میں سے تھے جنہیں، رسوم و قیود کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ ان کا حافظہ لاثانی تھا اور تعصب و قومی منافرت کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ انہوں نے ناول میں انگریزی ناول کی خصوصیات پیدا کیں اس لئے انہیں جدید فن ناول نویسی کا اردو میں موجد کہنا چاہیئے۔ فسانۂ آزاد اور ان کے دوسرے ناولوں میں جو معائب رہ گئے ہیں وہ اس عجلت، بے پرواہی اور کاہلی کا نتیجہ ہیں جو انکی طبیعت کا ایک مذموم جزو تھیں۔ وہ اپنے مسودات پر کبھی نظر ثانی نہ کرتے تھے اور نہ کبھی کاپیوں کی تصحیح کرتے تھے۔ جب ان کا آقا انہیں مجبور کرتا تھا، اس وقت وہ مجبور ہو کر لکھنے بیٹھتے تھے اور جو مواد ان کے پیش نظر ہوتا تھا اسی پر بس کرتے تھے۔ شہرت پسندی سے انہیں نفرت تھی۔ سرشار حقیقت نگار تھے۔ ان کا یہ مسلک نہ تھا کہ معائب کو چھپا کر صرف محاسن پیش کر دیں بلکہ وہ سوسائٹی کو جس حالت میں دیکھتے تھے اسی طرح اسکی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کی معاشرت کے جو مناظر سرشار نے پیش کئے ہیں وہ اس عہد کی سچی تصویریں ہیں فسانۂ آزاد کے سوا، آپ کو کہیں اصل حقیقت کا اتنا درست اور مفصل بیان نہیں ملے گا۔ یہی سرشار کی ظرافت کا حال ہے۔ انکے مذاق نہایت پرجوش اور بہت صاف ہوتے ہیں۔ ان میں غالب کی سی نزاکت اور لطافت نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ غیر مہذب بھی ہو جاتے ہیں۔ ظرافت کی کثرت اور بیباختگی، ان سے اکثر ایسی باتیں کہوا دیتی ہے جو انہیں نہ کہنی چاہئیں۔ اس معاملہ میں ان کا کوئی ہمعصر سرشار کی برابری نہیں

کرسکتا کیریکٹر نگاری کے معاملہ میں بھی سرشار کا درجہ بہت بلند ہے۔ انہیں اس فن میں پورا پورا کمال حاصل ہے۔ عیاشوں، تماش بینوں اور کاہل نوابوں کے مرقعے جو فسانۂ آزاد میں سامنے آتے ہیں وہ ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔ مگر انکی تصویریں، ان کی زندگی کے صرف ایک ہی پہلو سے متعلق ہیں اور اسی کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کرتی ہیں۔ سرشار نے مولوی نذیر احمد کی طرح غیر فطری باتوں کو یک قلم نظر انداز کیا ہے اور ان سے اپنے فسانوں میں ذرا کام نہیں لیا۔ اُن کے قصے زندگی سے متعلق ہیں اور ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جو روزمرہ واقع ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے سرشار کی اہلیت کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے ادیب تھے۔ اور آزاد، و نذیر احمد کی طرح ایک اسلوب کے مالک تھے جو انہی کا پیدا کردہ تھا۔ صاف اور سلیس اردو لکھنے اور خالص محاورے استعمال کرنے کے معاملہ میں انہیں بڑی قدرت تھی۔ ان وجوہ سے ان کی تحریر میں ایک ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے جو دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اسلوب کے معاملہ میں، ان کا درجہ آزاد کے بعد ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انکی تصنیفات قصہ کے لئے نہیں بلکہ صرف انکے طرز تحریر سے لطف اندوز ہونے کے لئے پڑھی جاتی ہیں۔ لوگوں نے انکی زبان اور محاورے کی صحت پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ کہیں کہیں وہ ایک انسان کی حیثیت سے غلطی بھی کرتے ہیں مگر اعتراضات کی بنا بغض و حسد پر قائم ہے۔

تصانیف ۔ فسانۂ آزاد، خدائی فوجدار، الف لیلہ بطرز ناول، جام سرشار، ہشو، بچھڑی دلہن، پی کہاں، کڑم دھم، کامنی، رنگے سیار، طوفان بے تمیزی،

شمس الضحیٰ ترجمۂ تاریخ روس، ترجمۂ خطوط لارڈ ڈفرن، سیر کہسار۔
ذیل کا مضمون آن کی مشہور تصنیف "فسانۂ آزاد" سے ماخوذ ہے۔

کوچہ گردوں کے پشت پناہ، رہ نوردوں کے قبلہ گاہ، اقلیمِ وحشت کے شہنشاہ ذی جاہ میاں آزاد کو ایک دن شوق چرایا کہ کسی مسجد میں جا کر نماز دوگانہ پڑھیں۔ سوچے کہ آج یوم الجمعہ، روز آدینہ ہے مکتبوں میں یہ آزادی کا سکہ بٹھاتا ہے۔ مسجدوں میں اسکے نام کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ آج کے مبارک دن سے سبزہ و گل بھی ہزار زبان سے وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں ہیں۔ بلبل رنگین گفتار کو وظیفہ معشوق حقیقی ورد زبان ہے۔ طاؤسِ طناز فرط طرب سے رقص کناں ہے۔ طوطی مثل حلہ پوشانِ جناں سبز پوش ہے۔ صوفی صافی نشۂ بادۂ عرفان حق معرفتناک میں سرخوش و مدہوش ہے جدھر دیکھو تسبیحیں کھٹا کھٹ چل رہی ہیں، شراب ارغواں کی مٹھوریں جوش سے ابل رہی ہیں۔ بارک اللہ۔ کیا روز برکت آثار ہے کہ ہر در و دیوار فیض بار ہے۔ جمعہ رہ گم کردگان بادیۂ ظلمت کیلئے چراغ سراغ ہے، جمعہ عرفان کا پھلا پھولا باغ ہے۔

میاں آزاد ایسے مزے میں آئے کہ معاً چل کھڑے ہوئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بڑے بڑے زہاد اور مولانا بالعلم والفضل اولٰنا اور قاضی و مفتی، شیخ و شاب عمامۂ فضیلت بر سر اور قبائے معرفت در بر، با جبہ و دستار

بصد فخر و افتخار چلے جاتے ہیں چہرہ سے نور الٰہی برستا ہے ساتھ میں دو رندان
ساغر نوش بصد جوش و خروش جن اور چڑیل کی باتیں کرتے اُنکے قریب آئے
ایک لحیم و شحیم دوسرا لاغر۔

لحیم۔ یار تم تو مغز کے بھیجے کے گودے کے کیڑے تک چاٹ گئے بڑے
بکّی ہو۔ لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے مگر تمہیں تو کچھ گھڑے
کی چڑھی ہے تم کب سُننے والے ہو۔ مرد آدمی یہ سب لغو باتیں ہیں واللہ
بنی ہوئی باتیں ہیں۔

لاغر۔ قبلہ مرد آدمی تو خواہ مخواہ آپ ہی ہیں۔ ماشاءاللہ صاحب تن و
توش، واللہ گینڈے بنے ہوئے ہو۔ یار کس چکّی کا پیسا کھاتے ہو موٹے آدمی تو
بہت دیکھ ڈالے مگر واللہ ہے جو ایسی کلائی ایک کی ہو مشاہا پٹھا پڑتا ہے
مگر استاد یاد رکھو ؎

اسپ لاغر میاں بکار آید روز میدان نہ گاؤ پرواری

جیسے تم بھدّے ویسی تمہاری عقل بھدّی۔

لحیم۔ بجا ہے پیر و مرشد۔ یونان کے حکما کا سرتاج تھیولز بھی بڑے تن و
توش کا آدمی تھا مگر اچھے اچھے حکیم ادیب اور علمائے ادیب اس کے سامنے
زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ یہ بحث شدہ ہیں موٹے اور دبلے سے کیا واسطہ
اگر آپ ثبوت پر بہت دکھا دیں تو ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں۔

لاغر- ہاں یہ دعویٰ! -ابھی پرسوں ہی کا تذکرہ ہے کہ میرے ایک دوست نے آدھی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی چوٹی تا بناف اور پیچھے کا مباف بال بال میں موتی پروے ہوئے یہ مسٹ مارے پڑے رہے منکے تک نہیں مگر آپ کہدیں گے جھوٹ ہے۔

نحیم بھائی یہ سب غپ ہے۔ یہ واہمہ وہ بلا ہے جو صورت بناوے اور سناوے حس و حرکت دکھاوے۔ چلا پھراوے۔ واہمہ خلاق ہے آپ کیا جانیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے آپکی۔ اور میاں کرور باتوں کی ایک بات ہے کہ بے دیکھے ایں جانب نہ پتیائیں گے۔ لوگ بات کا بتنگڑ اسوئی کا بھالا۔ بدرو کا نالا بنا دیتے ہیں۔ -ایک صحیح تو ننانوے لغو۔ پتا کھڑ کا اور بندہ سرکا۔ اور آپ ایسے ڈھلمل یقین حضرات کا تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ جو سنا فوراً تسلیم کر لیا۔ برہان و دلیل سے سروکار ہی نہیں۔ رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھا اور روح فنا ہو گئی کہ پریت جھانک رہا ہے بولے اور ہنٹوا لیا۔ کلبلائے اور گلا دبوچا۔ ذرا ہلے اور شامت آئی۔ اندھیرے گھپ میں تو یوں انسان کا جی گھبراتا ہے۔ اور جو بھوت پریت کا خیال جم گیا تو ساری چوکڑی بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں سب پھول گئے بلّی نے میاؤں کی اور مرغ روح قفس تن سے پرواز کر گیا۔ چوہوں کی کھڑبڑ سُنی اور بل ڈھونڈھنے لگے۔ اب جو چیز سامنے آئے گی پریت بن جائیگی۔ اس وحشت کے قربان۔ میاں بندۂ درگاہ سب پاپڑ بیل چکے ہیں۔ کئی جن

ہم نے اتارے کتنی چڑیلوں سے ہم نے محلے خالی کرائے جہاں دس جوتے کھوپڑی پر جمائے اور پریت نے بقچہ سنبھالا۔ میاں ہم جیتے جاگتے بھوت ہیں اور پڑھے لکھے جن۔ یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے کوئی ہم پر بلا دے تو جانیں۔ اور یوں گپ اڑائے کو کہئے تو ہم بھی بے پر کی اڑانے لگیں۔ یاد رکھو یہ عامل واہل سب رنگے سیار ہیں ع

روٹی کما کھائے کسی طور مچھندر

بندر نہ نچائے، مرغ نہ لڑائے، پتنگ نہ چپکائے۔ بھوت پریت ہی جھاڑنے لگے اتنا نہیں سوچتے کہ بھوت پریت چڑیل برہمراکس کو مانو تو پھر لونا چماری اور نٹ تتیا متیا کی بھی بیعت لاؤ۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ لونا چماری کو کوئی بھی مانے گا۔ ارے غضب۔ ارے ستم۔

لاعلم۔ خیر اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ۔ چلئے ہمارے ساتھ یہاں سے کوئی دو تین کوس کے فاصلہ پر گاؤں ہے وہاں ایک صاحب رہتے ہیں اگر آپکی کھوپڑی پر انکے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو گدھے کے پیشاب سے مونچھ منڈا ڈالوں۔ کہئے کا شریف نہیں چار ہے۔ پس اب چلئے۔ دعوے بے دلیل کے مہمل ہوتا ہے۔ بندہ بدیہی ثبوت دیگا۔ آپ نے نوجوان ذرا سی چڑھائی اور بس کہنا شروع کیا کہ سب پوچ، سب ہیچ، پیر و پیمبر، دیبی دیوتا، بھوت پریت، حور قصور، شیطان، خبیث، بہشت دوزخ تک کے آپ قائل نہیں

لیکن آج ٹھیک بنائے جائیگا۔ یہ کہکر وہ دونوں اُس گانوں کی طرف چلے
میاں آزاد تو دنیا بھر کے بیفکرے تھے ہی۔ شوق چرّایا کہ چلو سیر دیکھ آؤ۔ اچھی
دل لگی ہوگی۔ یہ بھی ان خیالات دقیانوسی کے جانی دشمن تھے اب کہاں
تو مسجد جاتے تھے کہ نماز دوگانہ پڑھیں کہاں چھوچھکے دیکھنے کا شوق ہوا۔ مسجد
کو دور ہی سے سلام کیا اور سیدھے سرا چلے۔ ارے کوئی اکّہ کرایہ کو ہوگا۔ کوئی
اکّے والا ہے۔ ارے میاں کوئی بھٹیارا اکّہ بھاڑے کریگا۔ جی ہاں کہاں کو
جائیگا۔ کہاں کو۔ سک جلدی پور۔ کیا دیجےگا۔ پہلے گھوڑا اکّہ تو دیکھیں۔ گھر
گھوڑ انخاس ہوں۔ وہ کیا کمائی دار اکّہ کھڑا ہے اور یہ سرنگ گھوڑی ہے۔
اسے! تو یہ۔ مریل۔ دبلی۔ پتلی۔ ہڈی ہڈی گن لو۔ یہ تو کوئی نو دن میں اڑھائی
کوس چلے گی۔ کون؟ یہ گھوڑی۔ واہ! بجو نہ ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے بیٹھے
اور دن سے پہنچے واہ وا۔ گھڑیا کیا ریل کا انجن ہے کہ چلتے ہی الوپ انجن
ہو جاتی ہے۔ اچھا کسو۔ چار آنہ دیں گے۔ دھیلی کے پیسے لیں گے۔ میاں
آزاد دوسری طرف چلے۔ پھر پلٹے اچھا پانچ آنے۔ نا ہیں خداوند۔ سات گنڈے
سے کوڑی کم نہ لیں گے۔ اچھا کسو۔ اتنے میں میاں آزاد نے ایک صاحب
سے پوچھا کیوں حضرت اس گانوں کو سک جلدی پور کیوں کہتے ہیں۔ بندہ
نواز اسکی بڑی داستان ہے ایک صاحب تھے شیخ جمال الدین انہوں نے
یہ گانوں بسایا۔ اور شوق چرّایا کہ اپنا پورا نام رکھ دیں شیخ جمال الدین پورا نام

رکھا گنوار آدمی شیخ جمال الدین کیا جانیں۔ انہوں نے شیخ کا سکتا و رجمال کا جل اور الدین کا دین کر دیا اتنے میں اِکّے والے نے آواز دی کہ یکّہ تیار ہے میاں آزاد جلدی سے اِکّے پر سوار ہوئے اور اکّہ کھڑ کھڑاتا چلا۔ اثنائے راہ میں انہوں نے پوچھا کہ کیوں بھئی دن بھر میں کیا مل رہتا ہوگا۔ ارے ہجور اب رجگار کہاں۔ صبح سے شام تک جو ملا چر ندم پرندم۔ دو ڈھائی آنہ جنو رکھا گیا۔ اور تین گنڈے گھر کے خرچ میں لگ گئے۔ دھیلے پیسہ کا سلیما تھا خو اُڑا یا۔ پھر موچی کے موچی۔ مہاجن کے پچیس روپیہ چھ مہینے سے بیباک نہ ہوئے۔ اور جو کہیں بچی ہیں چار پانچ کوس لے گئے۔ تو پٹھیاں دھنس گئیں۔ ہاں دھرے درے انجر پنجر سب نکل گئے۔ دو چار کے ماتھے لگی۔ اور میاں رجگار تو تمہاری سلامتی سے تب ہو جب ریل اُڑ جائے۔ اس نے سب رجگار لے ڈالے۔ اب آپ ہی نے سات گنڈے جلدی پور تک کے دیئے کل تین چلکر لگا کر۔ یہ تو رجگار رہ گیا ہے کل کے پیسہ نکلتا ہے۔ کوئی دو پونے دو گھنٹے میں میاں آزاد سک جلدی پور پہونچے۔ پتا دیتا تو ان کو معلوم ہی تھا سیدھے چلے اور عصا مل کے مکان پر کھٹ سے داخل۔ اللہ اللہ بڑی بھیڑ ہے۔ خلقت ہے کہ اُمڈی چلی آتی ہے۔ عورت مرد ٹوٹے پڑتے ہیں۔ تماشائیوں کا تانتا لگا ہے۔ ایک آدمی سے انہوں نے پوچھا کہ کیا آج یہاں میلا ہے۔ ناہیں میلا ویلا ناہیں ایک نئی کے موٹر پر آج پربت آئے ہے تو ل مہرار و منسیر و سب دیکھے آوت ہیں

ہاں ہے دل لگی۔ اس جھنڈ میں انہوں نے اس لچیم وشچیم آدمی کو ڈھونڈھ نکالا جو دعوی کر کے آئے تھے کہ بھلا ہم پر تو کوئی پریت بلا دیکھے اور تنہا ایک گوشے میں لیجا کر یوں کہا۔

آزاد۔ میاں ہم اس وقت مسجد کے پاس تمہاری چہ میگوئیاں کان دھر کے سن رہے تھے۔ رب کعبہ جو آج تک ہم کبھی بھوت پریت کے قائل ہوئے ہوں۔ یار اب کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ اس عامل کی قلعی کھل جائے۔

لچیم۔ اور میں آیا کس فکر میں ہوں آپ خاموش رہیں دیکھئے میں ابھی ابھی ٹھیک بناتا ہوں۔ ساری مشیخت کرکری ہو جائے تو سہی آج ہی تو پھنسے ہیں چڈا گلجبر وہ ایسا دباؤں کہ چھٹی کا دودھ نکل پڑے۔ اب ہم ایک سے دو ہوئے۔

اتنے میں عامل صاحب عباسی تہبند باندھے لمبے لمبے بال بڑھائے خنا کا تیل پڑا ہوا پٹیاں جمی ہوئیں مانگ نکالے کھڑاؤں پہنے تشریف لائے۔ آنکھوں سے جلال برستا تھا۔ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھا وہی کانپ اٹھا۔ کسی نے قدم لئے کسی نے سر پر ٹہاک کی اور انہوں نے غل مچانا شروع کیا کہ دھوئی میری جلتی ہے۔ جلتی ہے اور ملتی ہے۔ دھوئی میری جلتی ہے۔ کھڑی مونچھیں اور چڑھی ڈاڑھی لمبے گیسو والا ہے لمبی زلفوں والا ہے میرا درجہ اعلیٰ ہے جھوم جھوم کر جو انہوں نے ہانک لگائی تو حوالی موالی سب

سناٹے میں ہو گئے۔ ایک دفعہ ہی باآواز بلند پکارا کہ کسی کو دعویٰ ہو تو آکر کشتی
لڑے ہاتھی کو ٹکر دوں تو چنگھاڑ کر لوٹ دم بھاگے (خم ٹھونک کر) آ کون آتا ہے
اب سنئے کہ پہلے سے ایک شخص کو سکھا پڑھا رکھا تھا وہ تو سدھا ہوا تھا ہی جھپٹ
کھڑا ہو گیا۔ ہم لڑیں گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک ڈنڈ پیل کشتی گیر مقابلے کے لیے کھڑا
ہوا ہے۔ تین انچ کی دبیز گردن۔ گینڈا بنا ہوا۔ خدا ہی خیر کرے۔ مگر جاہل کی وہ ہوا
بندھی تھی کہ لوگ اس پہلوان کی حالت پر افسوس کرتے تھے کہ بیچارہ۔ جاہل
چٹکیوں میں زور سے چرمر کر ڈالیگا۔ الغرض دونوں آمنے سامنے آ گئے۔ اور
جاہل نے گردن پکڑتے ہی زمین پر دے پٹکا۔ وہ مارا کہ دو تگڑا بن گیا اور
پہلوان پندرہ منٹ تک بیہوش پڑا رہا۔ میاں آزاد نے خوجی سے کہا کہ یہ کی سنگت
ہے اسی طرح گنوار مفتخر ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جی میں ایسے مردودوں
کی قبر تک سے واقف ہوں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میاں جاہل نے پھر اکڑتے
ہوئے ہانک لگائی کوئی اور زور آزمائیگا۔ میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھپٹ
لنگوٹ باندھ دھم سے کود پڑے۔ آؤ استاد ایک ایک پکڑ ہم سے بھی ہو جائے تب تو
جاہل صاحب چکرائے کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ پوچھا آپ انگریزی خواں ہیں؟
آزاد نے کڑک کر کہا حضرت میں ہفتخواں ہوں۔ بس اب سنبھلئے کہ میں آ گیا۔ یہ کہکر
گتھا ٹھیک کر ڈالا جنگ کے پیچ پہ ارا چاہا دل شتابے سے چت جاہل نے زمین پر پٹخ
کرے۔ ان کا کرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب بتاؤ ناک کاٹ لوں کہ

کترلوں کان۔ باندھوں دم میں نمدا۔ بات بٹیرے کی عامل بنے ہیں۔ حکیم نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اٹھا لیا واہ اُستاد کیوں نہ ہو۔ میاں عامل کی ساری شیخی خاک میں مل گئی۔ گنواروں کا عقیدہ جاتا رہا۔ بیچارے کو اُسی دن گاؤں چھوڑنا پڑا۔ صحرائے دشت نوردی کے گردباد کی جودت وقاد میاں آزاد اس رنگے سیار عامل کو ٹھینگا بتا کر اور گاؤں کے ڈھلمل یقین گنواروں کو سیدھے ڈھرّے پر لگا کر میاں حکیم فہیم کو ساتھ لے ہاتھ میں ہاتھ دے شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اُسی عامل کی باتیں مزے مزے کی چہ میگوئیاں کھلی بازیاں ٹھٹّھے ہوتے جاتے ہیں۔ کہوں سچ کتنا کیسا اڑنگا دیا بہت بلبلا رہے تھے چیلا ہ

سمجھے تھے اب مرا کوئی سرکوب ہی نہیں
فرعون کیلئے کوئی موسیٰ نہ آئے گا

یہاں اُستادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں پور پور میں چالاکی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک پینچ کے دو دو سو توڑ یاد ہیں۔ گھنٹوں لڑوں ہانپنے کا نام نہ لوں۔ ممکن کیا کہ دم ٹوٹے۔ لڑنے کا تو کہنا ہی اُس کا نہ تھا گردن موٹی نہیں چھاتا چوڑا نہیں۔ بدن گٹھا پٹھا نہیں۔ کان ٹوٹے نہیں۔ چھنگلوں سے تاڑ گیا کہ اکھاڑ ہے۔ گردن پکڑتے ہی چرمر کر ڈالا۔ مارا چاروں شانے دھڑ سے زمین پر گرا۔ ارا ارا دھول۔ بہت بلوں پہ تھے بچ بچ۔ عامل کی دم بنے تھے یہ ماہی تو کرتا ہوگا قسم نسیمین کی جوان بالوں کی ذرا بھی اصلیت ہو کیسا پرینت

کس کا بھوت کہاں کی چڑیل۔ سب ڈھکوسلا سب گپ مگر خلقت بھی کیا بھیڑیا
دھسان ہے سُن لیا چاہیں بس فوراً ایمان لائیں۔ اور سُنیے ایک مرتبہ ایک جوگی
بسدھ پلتھا مار کر بیٹھے اور لگے ہنکارنے کہ کوئی چھپا کر ہاتھ میں پھول سے ہم
چٹکیوں میں بتا دیں گے آگ لگ گئی واللہ شعلے بدن سے نکلنے لگے میں نے
کہا اچھا ہم نے پھول لیا آپ بتایئے تو سہی پہلے تو آنکھیں نیلی پیلی کر کے
مجھے ڈرانے لگے۔ میں نے کہا میاں عقل کے ناخن لو۔ میں ان گیدڑ بھبکیوں
میں نہ آنے کا۔ یہ پہیلیوں کا تماشا کسی نادان کو دکھاؤ۔ لے بتاؤ بس بتاؤ تھوڑی
دیر سوچ کر بولے زرد پھول ہے۔ میں نے کہا کہیں ہو نہ زرد اتنا کہنا تھا کہ کہاں
پھول کا رنگ۔ زرد بتاتے تھے کہاں حضرت کا چہرہ زرد ہو گیا۔ رنگ فق ہے
کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پھر گھبرا کر فرمایا کہ ارے دھوکا ہوا سبز پھول ہے میں نے
کہا واہ بھی لال بھبوکا کیوں نہ ہو۔ بھینس نہ کودی کودی گون۔ یہ تماشا دیکھنے کو سارا
پھر ایک پھول آخر تک دیکھا نہ سنا۔ این گل دیگر شگفت۔ اچھا شگوفہ چھوڑا۔ واللہ
یہ نیا گل کھلا۔ واہ میاں کچھ بھی۔ میرا اس قدر کہنا کہ ان کا گلاب سا چہرہ کھل گیا۔ میری
باتیں کانٹے کی طرح چبھنے لگیں ادھر ادھر سے لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ واللہ کوئی
اُس وقت ان کی بیکلی دیکھتا اور میں جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ غنچے کی طرح
کھلا جاتا تھا۔ ان باتوں سے انہیں ایسا خار ہوا کہ بگولا بن گئے وہاں سے ڈنڈا لو اور بھاگے
بیچم سے کہا۔ استاد واللہ باللہ ایک قلم کو اپنا ہم ضمیر سمجھ رہا تھا۔ یار ہم بھی

یہ سب مکر کے پھیلے ہوئے ہیں۔ سب کھیل کھیلے ہوئے ہیں۔
سُنئے ایک دفعہ ایک صحبت میں جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتا ہوں
کہ ایک نیم ملا خطرۂ ایمان لسان الغیب بنے بیٹھے ہیں اور اچھے اچھے تربیت یافتہ
ان کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ پوچھا آپ کی تعریف کیجئے ایک صاحب نے جو اس
مزوّر کا ایمان لا چکے تھے دبے دانتوں کہا شاہ صاحب غیب داں ہیں آپکے
کمالات ظاہری و باطنی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دس پانچ نے تو
ان کو آسمان پر ہی چڑھا دیا۔ میں نے کہا تو ذرا جو اسے جھنڈے ہی پر نہ چڑھاؤں
کیوں شاہ جی صاحب قبلہ یہ تو بتایئے ہمارے گھر میں لڑکا کب تک ہوگا۔ شاہ جی
سمجھے کہ یہ بھی نرے چونگا ہی ہیں۔ چلو انا پ شناپ بتا کر چونگا کرو اور کچھ لے مرو۔
میرا اور میرے باپ دادا اور انکے باپ کے دادا کا نام پوچھا یہاں حافظہ کی
یہ کیفیت ہے کہ باپ کا نام تو اکثر یاد بھی رہتا ہے دادا جان کا نام کس ملعون
کو یاد ہو مگر خیر جو زبان پہ آیا الول جلول بتایا تو حضرت فرمانے لگے کیا ہیں بچے
دو جیتے کے اندر ہی اندر پٹیا لے۔ ہائیں! شاہ صاحب قبلہ ذری سنبھلے ہوئے۔
اب تو کہا اب نہ کہئے گا دیکھئے میں بتائے دیتا ہوں کیا خوب آپ اچھے سے
ابھی حضرت کچھ خبر ہے۔ پندرہ دن تو بندے کی شادی کو ہوئے اور آپ فرماتے
ہیں دو بچے کے اندر ہی اندر لئے کا سے یا اللہ۔ دوسرا کہتا تو خون پی لیتا اس فقرہ
پہ یار لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ کمرہ گونج اٹھا اور شاہ جی کے

آئے حواس غائب ہو گئے۔ دل میں تو کروروں ہی صلواتیں سنائی ہوں گی۔ اے حضرت
کیا عرض کروں اُس جوار میں لوگ انہیں معاذ اللہ خدا سمجھتے تھے۔ شاہ جی کبھی روپیہ
برساتے تھے کبھی بے فصل کا میوہ منگواتے تھے۔ کبھی گھڑے کو چکنا چور کر کے
پھر ثابت کر دکھاتے تھے۔ غرض سینکڑوں ہی اسٹیٹیں یاد تھیں مگر میاں میر
سامنے تو ایک نہ چلی۔ نام سُنا تو ہکا بکا ہو گئے صورت دیکھی اور تھرا اٹھے جیسے
شاہ چور سے اور سانپ مور سے ڈرے۔ میاں آزاد نے مسکرا کر کہا واللہ شاہ
اور چور کی اچھی تشبیہ دی۔ بھئی سنو آزاد ہم گنوار آدمی تین پانچ تو جانتے نہیں ہیں
بات کرنا کیا آئے۔ یار ہم تو دوست کے دوست ہیں مگر ایسے قابوچیوں کے البتہ
دشمن ہیں۔ جہاں میں ہوں بھلا کسی سدھ یا شاہ جی یا عامل کا رنگ تو جم جائے۔
کیا مجال۔ رگید رگید کر اور کھدیڑ کھدیڑ کر ماروں ادھر اکر دوں۔ تو وجہ کیا ہے میں تو زمانہ
بھر کا نیار یا پٹا ہوا شہدا۔ ایک ہی کائیاں ہوں مجھ سے اکڑ جائیں گے
کہاں نیچے پاتال تک کی تو خبر میں لاؤں۔ اور آسمان میں تھگلی لگاؤں۔ مجھ پہ
بھلا وہ بیچارے کیا ہاتھ صاف کریں گے۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک صاحب نے پوچھا کہ کیوں پیر و مرشد آپ
انگریزی پڑھے ہیں۔ میاں آزاد نے کہا جی ہاں کچھ شد بد جانتے ہیں۔ آپ اپنا
مطلب کہیں۔ یا حضرت ایک دوہا عربی کا ترجمہ منظور ہے۔ میرے یہاں ہفتاد
پشت پر احسان ہو گا اس کو صحیح انگریزی میں خوب نمک مرچ لگا کر لکھ دیجئے

نمک مرچ! نمک مرچ لگانا میں کیا جانوں ۔ یہ کسی گول گپے والے سے کہئے ۔
بندے نے کالج میں یہ علم پڑھا ہی نہیں ۔

(۱۵) عزمی اور ہندی

(نواب نصیر حسین خیال)

نواب نصیر حسین خیالؔ قوم کے اُن مخصوص افراد میں ہیں جنکا نام ہمیشہ نہایت عزت و احترام کے ساتھ لیا جائیگا ۔ انہیں اُردو زبان اور ادب کے ساتھ جو محبت اور دلچسپی ہے اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی ۔ حضرت خیالؔ نسبی اعتبار سے نہایت مستند سید اور خاندانی رئیس ہیں ۔ انکے مورث عرب سے ایران آئے اور وہاں اس قدر اقتدار حاصل کیا کہ سید حسین فیروزی شاہ طہران ہوئے ۔ اور آنکے پوتے کبیر المشائخ ہرات کے گورنر رہے ۔ جب یہ خاندان ہندوستان آیا تو یہاں بھی اسکے افراد صوبہ داریوں اور وزارتوں پر مامور ہوتے رہے ۔ عہد مغلیہ میں اس خاندان کو بڑا اقتدار حاصل ہوا چنانچہ قطب الملک نواب سید عبد اللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں "بادشاہ گر" کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے تھے ۔ اور ایک عرصہ تک کاروبار سلطنت میں ان دونوں بھائیوں کو دخل رہا ۔

مبین علی خاں کے بعد انکی جاگیر انکے چھوٹے بھائی نواب زین الدین علی خان بہادر
(نواب خیال کے پردادا) کے ہاتھ آئی اور وہ بہار میں قیام پذیر ہوئے۔ اس طرح یہ خاندان
دہلوی سے بہاری بن گیا۔ دلی کے لٹنے پر وہاں کے صاحبان کمال نے عظیم آباد کا رخ کیا
اور یہاں انکی بڑی مدد کی گئی۔ امیر الامراء نے اردو کی بڑی سرپرستی کی اور انہی کے ذریعہ سے
یہ زبان بہار میں پھیلی۔ انکے بعد نواب علی وردی خاں مہابت جنگ اور پھر راجا شتاب رائے
نے اردو کی حمایت کی۔ غرض یہ کہ اس خاندان میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنکی
سرپرستی میں اردو صوبہ بہار میں ترقی کرتی رہی۔

نواب خیال ۱۸۷۸ء میں بمقام عظیم آباد پیدا ہوئے اور اپنے خاندان کے اخلاق
وآداب جو اپنے مقام پر تمدن قدیم کی یادگار اور آپ اپنی مثال ہیں سیکھے۔ اس کے بعد
علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ حضرت خیال کو علم ادب کا شوق بچپن سے
تھا اور چونکہ زبان کی محبت انکے خمیر میں شامل تھی اس لئے ابتدائے عمر ہی سے مضمون
نگاری کی طرف میلان ہو گیا۔ پہلے پہل حیدرآباد کے مشہور رسالہ "حسن" آپ کے مضامین
فرضی ناموں سے نکلتے رہے۔ جب یہ پرچہ بند ہوا تو اور اور رسائل میں لکھنا شروع کیا۔
آپ نے ۱۹ سال کی عمر میں ۱۸۹۷ء میں عظیم آباد سے ایک رسالہ "ادیب" نامی نکالا
اسکے ادبی مضامین کو دیکھ کر سر سید مرحوم اور مولوی عبدالحلیم شرر نے اس وقت یہ رائے
قائم کی تھی کہ اگر یہ رسالہ جاری رہا تو عظیم آباد اور صوبہ بہار دلی اور لکھنؤ کی تقلید سے
آزاد ہو جائیگا۔ چند روز بعد یہ رسالہ بند کرنا پڑا مگر مضمون نگاری جاری رہی ۱۹۰۳ء میں

آپ نے ایک مضمون "مہذب خیرات" کے عنوان سے اصلاح میں لکھا اور اس کے ذریعہ سے ملک میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ پھر ۱۹۰۸ء میں "مرثیہ اور مرزا دبیر" پہ ایک مبسوط مضمون دکن ریویو میں شایع کیا۔ پھر ۱۹۱۱ء میں ایک نہایت پُر لطف مضمون "خالاؤں کا مارا آغا" ادیب الہ آباد میں شایع ہوا۔ یہ مضمون اور خصوصاً اسکی تمہید اردو کی جان اور حقیقتاً وہ لٹریچر ہے جسکی نظیر "ایڈیسن" اور "پکوک پیپرز" کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اردو میں یہ بالکل نئی چیز تھی اور اس سے نواب صاحب کی فارسی پر بھی وہ قدرت معلوم ہوتی ہے جو اس زمانہ میں مفقود ہے۔ یہ قصہ اس طرح پڑھا گیا کہ ہزاروں کو اب تک اس کے فقرات یاد ہیں۔ یہ مضمون اس لیے لکھا گیا تھا کہ دوسرے اس رنگ کو اور شوخ کریں۔ مگر اس کا تتبع آسان نہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے اب تک اس انداز میں کوئی قلم نہ اٹھا سکا۔"

نواب صاحب کی زباندانی مسلم ہے، جس موضوع پہ قلم اٹھاتے ہیں اپنا کر لیتے ہیں۔ اردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت اسکی زندہ مثال موجود ہے۔ زباندانی اور ادبیات سے شغف کے علاوہ، نواب صاحب کا علمی مذاق بھی معمولی نہیں۔ آپ کے تاریخی معلومات اس قدر وسیع ہیں کہ آپ کو ادیب کے ساتھ مورخ کہنا بھی بہت بجا اور درست ہے۔ ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ نواب صاحب قومی معاملات میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ آپ ۱۹۰۶ء کے مسلم وفد کے سرگرم کارکن اور ممبر تھے اور مسلم لیگ کے بانیوں میں ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں آپ نے مسلم لیگ کی شاخ بنگال میں قائم کی۔

تعلیمی معاملات سے آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی مقرر کئے گئے۔ آج کل جناب نواب صاحب گوشہ نشین ہیں۔ اور اپنی زندگی کے زریں لمحات علمی مشاغل میں بسر کر رہے ہیں۔ ذیل کا مضمون خطبۂ صدارت کا ایک جزو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے آپ اپنی مثال ہے۔ (ماخوذ)

راجہ داہر کی جنگ و شکست پرانی تاریخ ہند کا اخیر ورق اور عربی و ترکی و ایرانی خروج کا دیباچہ اور غیر اقوام سے نئے ارتباط و تعلق اور پائدار رشتہ کے پیدا و قائم ہو جانے کا دلچسپ عنوان ہے۔ اس ملک میں اب تک باہر کی ٹولیاں آئیں اور اپنی زبانیں ساتھ لائی تھیں۔ مگر اب ہوا پلٹی اور ہند کی ٹولیاں بھی باہر نکلیں۔ اور اس اینچ پینچ کی بدولت زبانوں کا سکہ دونوں جگہ کرنسی ہونے اور چلنے لگا۔

قاسم تین برس سندھ میں رہا اور اپنی ملک دانی کی بدولت یہاں پوجا گیا۔ اس کے اکثر ساتھیوں اور لشکریوں نے یہاں وصلت کی اور گھر بنا کر رہے۔ اس کے جانے پر عرب کا قافلہ ٹوٹا اور بازار سندھ بیزار سا نظر آنے لگا عرب فتح فارس سے بہت سبق سیکھ چکے تھے اور نو وارد دین کو غیر ملک میں جو دشواریاں پیش آیا کرتی ہیں اس کا تجربہ رکھتے تھے۔ زبان کی دقتیں سب فتوں پر ہمیشہ بالا ہوا کرتی ہیں وہ اُسے بھی خوب جھیل چکے تھے۔

اور جس ملک کو انہوں نے گونگا (عجم) کہا اس کے آلۂ زبان سے بھی آخر

کام رہ چکے تھے۔ یہاں کی مشکلیں ان کے لیے آسان تھیں۔ انہوں نے بلاتعصب وحقارت اپنی مفتوحہ زبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے بھی پہلو میں لا بٹھایا! خوش قسمتی تھی سندھ کی کہ اُسے عرب جیسے فراخ دل و قدر دان ملے!۔

جنھوں نے محض اپنی زبان کا زور اور فاتحانہ قوت دکھانے اور صرف اپنے ہی ارگن (زبان) کو وقت نا وقت بجواتے رہنے کی ہوس میں کہیں کی شہنا (زبان) کا کلیجہ نہ چھیدا!

وہ خود صاحب زبان اور ادب (لٹریچر) کے مالک تھے اس لیے وہ دوسری زبانوں اور دوسرے لٹریچر کی قدر کر سکتے تھے وہ جانتے تھے کہ کس قوم کو الکن کر دینا اس کی ہستی کو معدوم کر دینا ہے اور اس لئے ان میں کوئی ایسا بیدرد پیدا نہ ہوا۔ جس نے اپنی ہوم گورنمنٹ کو کسی ڈسپیچ کے ذریعہ سے اس قوم کی زبان کی تحقیر و تذلیل کی ہو! انکی (عرب) زبان گو اس وقت علوم و فنون کی نہر لبن بنی ہوئی تھی مگر انہوں نے محض اپنی آسانیوں کی خاطر دوسروں کی گردنیں اُدھر نہ جھکائیں۔ وہ سمجھتے اور حق سمجھتے تھے کہ یہاں کی زبین کی شکم میں خود شہد شیر کی نہریں موج مار رہی ہیں۔ یہ ملک خود اپنے رواۃ (ٹریڈیشن) اور اپنا سوبلیزیشن رکھتا ہے اور اس کا ادب و لٹریچر دنیا میں ممتاز رہا ہے اس لئے اسکی قدر کی اور ایک پرانی قوم کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین نہ ہونے دیا!

دوسری طرف ہندی بھی غیر اقوام اور غیر زبانوں کے صدیوں سے

عادی ہو رہے تھے۔ عربی نئی ہو مگر غیر زبانوں کا پھیٹ انکی زبان کھمبر میں آچکا تھا۔ ان کے کان بیرونی لب ولہجہ اور حروف کے مختلف اصوات سے آشنا ہو چکے بلکہ انکے حلق و دندان تک ان آوازوں کھٹکوں اور شعبوں کے مخارج بن چکے تھے۔ اس کے علاوہ خود ان کے ملک میں کئی کئی زبانیں اسوقت تک رائج تھیں وہ انھیں بے تکلف سمجھتے اور بولتے بھی تھے۔

ایسے ہفت زبانوں کے لئے ایک عربی کیا مشکل تھی۔ انہوں نے اسکا بھی خیر مقدم کیا اور اپنے گھر میں اُسے بھی جگہ دی!

وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حکومت کسی پیچدار مقراض سے ہماری زبان کاٹنا نہیں چاہتی۔ وہ (حکومت) خود اس طرف بڑھ رہی ہے اور ہماری اُسکی مشکل برابر کی ہے۔ انہیں (اہل ہند) اس کا بھی علم تھا کہ ہمارے فاتحین کی زبان پہلے ایک ہی سمندر تھی اور اب تو قلزم بن رہی ہے اس سے اپنے چشمے کی سوتوں کو ملانا اور بڑا کرنا چاہئے۔ بے اطمینانیوں اور غلط فہمیوں کا راستہ کھلا نہ تھا دونوں اپنے حدود کو سمجھ کر آگے بڑھے اور کوئی تصادم نہیں ہوا اور یوں عربی و ہندی کی آمیزش شروع ہو گئی۔

یہ اُس بے تکلفی و یک جہتی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے عرب کے عظیم الشان دربار تک یہاں کے علماء و فضلا حکیموں اور پنڈتوں کی رسائی ہوئی اور اہل ہند کا اتنا اعتبار اور رسوخ بڑھا کہ ہارون رشید نے کنکا مانک یا یا کبیراج کو اپنے

علاج کے لئے یہاں سے طلب کیا اور اسے عزت و افتخار کی کرسی بخشی۔

یہی وہ زمانہ ہے کہ عرب سیاح اس ملک کی سیر کو آتے اور یہاں سے خوش خوش جاتے ہیں۔ مسعودی بھی انہی دنوں ادھر آیا اور اس ملک اور اہل ملک کی تعریف کرتا ہوا واپس گیا۔ ابن حوقل جو اسکے بعد یہاں کی سیر کو آتا اور ہندو مسلمانوں کے رشتۂ اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا اور کہتا ہے کہ ان دو قوموں (ہندو مسلماں) کے لباس، تمدن و معاشرت اور انکی رفتار و گفتار میں فرق و امتیاز مشکل ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ملتانی و فارسی عام ہے۔

جغرافیۂ قدیم کی رو سے سندھ و برج کا ڈانڈا ملا ہوا تھا اور اسی وجہ سے دیگر صوبہ جات سے زیادہ ان دونوں خطوں میں اختلاط و ہم آہنگی تھی۔ مرغزار برج کی کوئل یوں تو کہاں نہیں کوکی اور کس دل کو اس نے اپنی طرف نہیں کھینچا مگر سندھ کا پائیں باغ تھا۔ وہاں اس وقت سب سے زیادہ اثر پڑا۔ وہ بلبل ہند (بھاشا) جو باغ باغ اور چمن چمن کے پھول اپنی منقار میں لئے ہوئے تھی جب اڑکر ادھر پہنچی تو اپنے گلدستہ کے لئے عربی کے گل سرسبد بھی اس نے چنے اور اپنے آشیانے میں سجا کر رکھے۔

سندھی ہو یا یہاں کی اور پراکرتیں وہ خودرو تھیں، لائق باغبانوں نے بھی انہیں ہاتھ نہیں لگایا اور نہ باہر کے چشموں نے انہیں سینچا اس لئے وہ مرجھا گئیں اور بے برگ و بار رہیں۔ برخلاف اس کے برج بھاشا کا نٹ چھانٹ کر درست کی گئی

اور پھلدار و میوہ دار بنی۔ شعرا اور ادیبوں نے اس کی آبیاری کی وہ بڑھی اور
گھنی ہوئی اور ہر طرف چھا گئی اور اور پراکرتوں کے ساتھ سندھی بھی اس سے
دبی اور آخر اسی کے زیر سایہ رہنے لگی۔

(۱۶) بنت بہادر شاہ

(خواجہ حسن نظامی)

خواجہ حسن نظامی دہلوی سنہ ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ انکے والد نہایت غریب آدمی تھے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ میں رہتے تھے۔ حسن نظامی نے اخبارات درسائل میں لکھنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ ان پہ شبہ کرتی رہی اور پولیس نے انکی نگرانی کی۔ صوفی ہونے کی حیثیت سے خواجہ حسن نظامی کو ملک میں اقتدار حاصل ہوا اور روز بروز بڑھتا رہا۔ خواجہ صاحب بہت سی کتابوں اور رسائل کے مصنف ہیں لیکن ان سب میں بہت بلند خیالات یا کوئی خاص پیغام نہیں۔ انکی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت عامۃ الورود موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ مگر انکے لکھنے کا طرز کچھ ایسا ہے کہ اپنی تحریر کو نہایت دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ انکی تحریروں کے لئے یہ کہنا کہ عام فہم ہوتی ہیں، انکی کوئی خصوصیت نہیں۔ اس لئے کہ وہ بیشتر عوام الناس ہی کے لئے

لکھی جاتی ہیں۔ خواجہ صاحب کو نئے عنوان تجویز کرنے میں بڑا ملکہ ہے۔ ان کے خیالات میں عمق بالکل نہیں ہاں تخیل کی نزاکتیں کہیں کہیں ضرور پائی جاتی ہیں مگر زیادہ تر سطحی ہوتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی تحریر میں ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے مگر ان کا ادنیٰ کمال یہ ہے کہ معمولی باتوں سے بڑے بڑے مفید اور کارآمد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی تحریروں نے ملک کو ایک فائدہ یہ پہنچایا کہ عوام میں اخبارات و رسائل پڑھنے کا ذوق پیدا کر دیا۔ ذیل کا مضمون غدر دہلی کے افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے۔

تصانیف تعلیم القرآن، اسلامی توحید، اسلامی رسول۔ اسلام کے عقاید، رسول کے معجزات، تاکید نماز، داعی اسلام، میلاد نامہ، محرم نامہ، یزید نامہ، طمانچہ بر رخسار یزید، شامی جہاد، ذکر غوث پاک، کرشن جیون، ہندو مذہب کے معلومات، گاندھی نامہ، سلاطین بہمنی، بیوی کی تعلیم، بیوی کی تربیت، جگ بیتی کہانیاں، آپ بیتی، چٹکیاں اور گدگدیاں، سیپارۂ دل، کم ٹو موت، مرشد کو سجدۂ تعظیم، شیخ سنوسی، جرمنی خلافت، سفرنامۂ ہندوستان، فرام قبلہ ٹو شملہ، تمباکو نامہ، شیطان کا طوطا، مختصر خسرو نامہ، پرندوں کی تجارت، خدائی انکم ٹیکس، فلسفۂ شہادت، مفلسی کا مجرب علاج، حلوائی کی تعلیم، پنواڑی کی دوکان، غدر دہلی کے افسانے، بچوں پر ستم، چودھویں صدی کی تمہید، حلال خور، پڑوس کے ستر پاجی، سفرنامہ ممالک اسلامیہ، وغیرہ وغیرہ۔

نوٹ — یہ ایک بے چاری درویشنی کی سچی کہانی ہے جو زمانہ کی گردش سے ان پر گزری۔ ان کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا یہ دلی کے آخری مغل بادشا

ابوظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھیں۔ چند سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔
میں نے بارہا شہزادی صاحبہ سے خود انکی زبانی اُن کے حالات سُنے ہیں۔
کیونکہ ان کو ہمارے حضور خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی خانقاہ سے
خاص عقیدت تھی۔ اس لئے اکثر حاضر ہوتی تھیں۔ اور مجھ کو انکی دردناک باتیں
سننے کا موقع ملتا تھا۔ نیچے جس قدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود انکی
بیان کردہ باتیں ہیں یا انکی صاحبزادی زینب زمانی بیگم کی جو اب تک
زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتی ہیں۔

جس رات میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت
آیا تو دلّی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اُجلے اُجلے
سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا
تھا۔ زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لئے بلکتی تھی فکر اور
پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا اور نہ کسی انّا کے۔ ہم سب اس یاس
ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔
آدھی رات کا وقت سنّاٹے کا عالم گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے لیکن
حکم سلطانی ملتے ہی حاضری کے لئے روانہ ہو گئے۔ حضور مصلّے پر تشریف
رکھتے تھے تسبیح ہاتھ میں تھی۔ جب میں سامنے پہنچی جھک کر تین مجرے بجا لائی
حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے کلثوم لو اب تم کو

خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے تم اپنے خاوند کو لیکر چلی جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں۔ پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمھاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لیے بلند کئے جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے۔ دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے خداوند یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں۔ دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں تیمور کے نام کی عزت رکھیو۔ اور ان بیکس عورتوں کی آبرو بچائیو۔ پروردگار یہی نہیں تمام ہندوستان کے ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آج کل سب پر مصیبت چھائی ہوئی ہے میرے اعمال کی شامت سے ان کو رسوا نہ کر اور سب کو پریشانیوں سے نجات دے

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ زینب کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو بھی ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ

کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں دوسری نواب نور محل تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار نے لگے صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا ہم نے اپنے بھرے پڑے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈنے لگے۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں انکے بوجھ سے کانپ رہی تھیں۔ گویا صبح کے تارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر کار لال قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانیکو میسر آئی۔ اور اس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی و متنجن سے زیادہ مزیدار معلوم ہوئیں۔ ایک دن رات تو امن سے بسر ہوا دوسرے دن گردونواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی ان لیڈروں کے ساتھ تھیں جو چڑیلوں کی طرح ہم کو چمٹ گئیں تمام زیور اور کپڑے ان کمبختوں نے اتار لئے جس وقت یہ سڑی بسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو انکے لہنگوں سے ایسی بو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی

روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ دیکھئے اب کیا پیش آئیگا۔ زینب پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی بھائی تھوڑا پانی اس بچی کو لا دے۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری بہن ہے اور میں تیرا بھائی۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کا نام بستی تھا۔ اس نے اپنی بہل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کرایا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہونچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں، وہاں لےچل۔ بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا۔ مگر میر فیض علی نے ایسی بےمروتی کا برتاؤ کیا جسکی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ میں تم لوگوں کو ٹھیرا کر اپنا گھر بار تباہ و برباد کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا۔ زمین آسمان میں کہیں ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہوگی۔ اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم۔ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً کیا جائے وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے فقط زبانی بہن کہنے کو آخر تک نباہا۔ اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ لاچار اجاڑہ سے روانہ ہوکے اور حیدرآباد کا رخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے

تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہونچے جہاں گونڈل کے نواب کی فوج پڑی تھی انہوں نے سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر مدارت کی اور ہاتھی پر سوار کرکے ندی کے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے کنارے پر اُترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لیکر جلدی چلے جائیے ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تنبار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی۔ جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اُٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا۔ ہم لوگ وہاں سے نکلکر بھاگے۔ پر ہائے کیسی مصیبت تھی۔ ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا۔ گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر حواس باختہ ہزار دقت سے کھیت کے باہر آئے۔ میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خون خون ہو گئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں۔ زینب پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہم کو سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بیہوش ہو گئیں۔ میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی۔ اور دل میں کہتی

تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کہیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہوگئی لیکن فقیروں کو بھی چین اور اطمینان ہوتا ہے یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ بستی ندی سے پانی لایا۔ ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا۔ نور محل نے ذرا آنکھ کھولی تو میں نے پوچھا۔ اچھی اماں جان اٹھئے آپ کا کیا حال ہے؟ یہ سنکر نور محل رونے لگیں۔ اور بولیں ابھی خواب میں تمہارے باباجان حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آج ہم غریبوں کے لئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا مخملی فرش سے بڑھکر ہے۔ نور محل گھبرا نہیں ہمت سے کام لینا۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھادو۔ میں جیل خانہ جانے سے پہلے اس کو دیکھوں گا۔

بادشاہ کی یہ باتیں سنکر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ کلثوم کہا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا گیا ہوگا؟ کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیل خانہ بھیجے گئے ہوں گے؟ مرزا عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ یہ خواب و خیال ہے۔ بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکی نہیں کیا کرتے تم گھبراؤ نہیں۔ وہ اچھے حال میں ہوں گے۔

(۱۷) مظلوم کی فریاد

(محمد عبد الراشد الخیری)

محمد عبد الراشد الخیری اردو زبان کے ایک عظیم الشان ادیب اور قابل فخر انشاپرداز ہیں۔ آپ دہلی کے باشندے اور وہاں کی زبان کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ دلی کی زبان کے اس جزو کا جسے خالص خواتین کی زبان کہا جا سکے حضرت راشد نے خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور اس کے قلمبند کرنے میں غالباً ملک میں کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں۔ علامہ نذیر احمد کے بعد کسی ادیب کو سوائے مولانا راشد کے دلی کی زبان پر اتنا عبور حاصل نہیں ہوا۔ ان کو صرف عورتوں کی زبان ہی پر قدرت نہیں بلکہ انکے جذبات و خیالات کا بھی ان سے بہتر سمجھنے والا نہیں۔ اس قدرت و واقفیت کے ساتھ ساتھ خدا نے انکے دل میں جنس نازک کے ساتھ ایک ہمدردی بھی پیدا کردی ہے۔ یہ اسی درد کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی اور زندگی کی تمام کوششیں فرقۂ نسواں کی حمایت و اصلاح، ترقی و بہبود کے لئے وقف کردی ہیں۔ ان کا صرف ایک موضوع ہے اور انہیں آپ کبھی اس سے علیحدہ نہ دیکھیں گے۔ یہ خصوصیت بہت کم انشاپردازوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر یہی وہ بات ہے جو ایک لکھنے والے کو آسمان ادب کا ایک روشن ستارہ بنا کر چھوڑتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ موضوع پر قادر ہوئے بغیر اسلوب کا مالک ہونا ناممکن نہیں تو دشوار

ضرور ہے۔ راشد الخیری ایک زبان کے ماہر اور ایک موضوع پر قادر ہیں اور ان دونوں کا امتزاج نے انہیں ایک ایسے اسلوب کا مالک بنا دیا ہے جو انہی کی ذات کے لئے مخصوص اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ اس موضوع پر مولوی نذیر احمد نے ابتدا کی تھی مگر وہ اسے تکمیل کو نہ پہنچا سکے نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ نسواں کو چھوڑ کر پوری مسلم سوسائٹی کی اصلاح ان کا موضوع بن گیا اس لئے وہ عورتوں کے معاملات پر پوری توجہ نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اس ذیل میں مہارت کامل پیدا نہ ہوئی۔ موضوع ابھی تشنہ تھا اور راشد کو فطرت نے اس شعبہ میں بصیرت خاص مرحمت فرمائی تھی۔ اسکے علاوہ ضروریات زمانہ کا بھی تقاضہ تھا کہ جلد از جلد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی جائے اور کوئی واقف کامل اپنے کو صرف اس کیلئے وقف کر دے۔ بس انہوں نے اس تخم کی جسے علامہ نذیر احمد نے بویا تھا آبیاری شروع کر دی اور اپنی ذہنی خصوصیات کی مدد سے جنہیں فطرت نے صرف اسی کام کے لئے وضع کیا تھا رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان درخت بنا کر کھڑا کر دیا۔ یہ فخر بہت کم ادیبوں کو میسر ہوتا ہے کہ انہیں اسلوب کا مالک کہا جا سکے۔ مگر غالب، آزاد، نذیر احمد کی طرح راشد بھی ایک اسلوب کے مالک ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ سادگی، سلاست اور عام فہمی بھی انکی تحریر کی خصوصیات ہیں، تعجب کی بات ہوگی کیونکہ یہ جملہ محاسن ان کے موضوع کا لازمہ ہیں اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو ان کی تحریر میں اس قدر دلکشی، اثر اور جاذبیت نہ ہوتی۔ سرزمین دہلی کو ناز کرنا چاہیئے کہ اس نے نذیر احمد کے بعد اسی خاندان سے ایک اور مالک اسلوب

پیدا کرکے ملک کی وہ خدمت کرائی جس کے لئے اس سے پہلے کوئی کمر ہمت باندھ سکا تھا
مولانا راشد کو عورتوں کی مسرتوں سے زیادہ اُنکے غموں میں دلچسپی ہے اور اسی لئے اہل
ملک نے انہیں مصور غم کا خطاب دیدیا ہے۔

تصانیف:- الزہرا، لڑکیوں کی انشاء، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی، نوحہ زندگی، سراب مغرب، منازل السائرہ، جوہر قدامت، عروس کربلا، بنت الوقت، یاسمین شام، آفتاب دمشق، سمرنا کا چاند، ماہ عجم، درشہوار، موؤدہ، محبوبۂ خداوند، گوہر مقصود، تابندہ غلیبی، سنجوگ، سوکن کا جلاپا، شاہین و دراج، قطرات اشک، روداد قفس، فسانہ سعید، انگوٹھی کا راز، تیغ کمال۔

ذیل کا مضمون رسالہ عصمت سے لیا گیا ہے۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا غالب کا یہ شعر مشکل ہو یا آسان مگر سر الفاظ کلیجہ میں گڑنے والا ہے۔ اصلی معنی کچھ ہوں مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بدنصیب بلبل صیاد کے پھندے میں آپھنسی بہار کا موسم تھا باغ پھولوں سے مہک رہا تھا ہزاروں ارمان دل میں تھے مگر صیاد کے ظلم نے ساری امنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ باغ چھوٹا پھول چھوٹے آشیاں چھوٹا اور ان سب کے بدلے قفس کی تیلیاں اور صیاد کا آب ودانہ میسر ہوا۔ بہتیرا سر ٹکرایا ہر چند پھڑ پھڑائی مگر نہ رہائی ہوئی نہ جان نکلی اسی حالت یاس میں دن پورے کر رہی تھی کہ صیاد نے ایک اور بلبل کو پکڑا اور اسی پنجرے

میں قید کیا وہ دل جو مر چکا تھا جس کے تمام ارمان جس کی تمام آرزوئیں بے رحم صیاد نے ختم کر دی تھیں ایک ہم وطن کی صورت دیکھ کر پھر تازہ ہو گیا۔ نئی بلبل سے ایک ایک کی خیر صلاح پوچھی۔ سرو کا درخت کس طرح ہے؟ گلاب کا پودا اچھا ہے؟ میرے آشیاں کی کیا خبر ہے؟

بلبل نو گرفتار باغ کا مفصل حال بیان کرتے کرتے اتنا کہہ کر رک گئی کہ کل میری گرفتاری سے کچھ دیر پہلے تیرے آشیاں پر بجلی گری اور جلا کر خاک کر دیا۔ حسرت بھرا دل یہ سنکر کہتا ہے کہ پیاری بہن! ڈر نہیں صاف صاف کہہ اب وہ آشیاں میرا نہیں ہے میں کہاں اور وہ کہاں نہ اس قید سے چھوٹونگی نہ آشیاں کی صورت دیکھوں گی۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کم و بیش ایسی ہی حالت آج کل ہمارے ہاں بیویوں کی ہے ایک خطبہ نکاح نے ان سے تیرہ چودہ برس کے عزیز دم بھر میں چھڑوا دیے اور ایک ایسے کے قبضہ میں پہنچا دیا جس کے اوپر زندگی کا تمام دار و مدار ہے۔

ماں باپ غیروں کی طرح الگ ہو گئے سہیلیاں سہیلیاں بہنیں بھاوجیں سب چھوٹیں اور نقد بر نے ایک ایسے گھر میں لا ڈالا جس کی پہلے صورت بھی نہ دیکھی تھی یہ سب کچھ کیوں؟ اس امید پر کہ سمجھدار شوہر قدر کرینگے دیکھیں گے اور

سمجھیں گے کہ یہ کون ہیں کہاں سے آئیں اور کیوں آئیں؟ ان کو روٹی نصیب نہ تھی کپڑے کو محتاج تھیں رہنے کو جگہ نہ تھی۔ ماں باپوں کو دیکھئیں آخر کوئی تو وجہ تھی کہ جنھوں نے دکھ سہے مصیبتیں جھیلکر پالا پوسا وہ بالکل ہی لادست ہوگئے۔ یا دم بھر آنکھ سے اوجھل کرنے کے روادار نہ تھے یا مہینوں ہو جائیں اور آکر خبر نہ لیں۔ ایک ایسے شخص کے اوپر سے جواب تک قطعی غیر تھا۔ اپنے تمام حقوق قربان کر دے اور جان بیچکر سودا کیا۔ اگر ایسا سودا کرنے والے ٹوٹا بھگتیں تو انکے بدنصیب ہونے میں کسے کلام۔ افسوس آتا ہے ان شوہروں کی حالت دیکھکر جو بیوی کے معنی ہی خدمتگزار کے سمجھے ہیں۔ مانا کہ بعض جگہ بیویوں کی قدر وہ ہو رہی ہے جو ہونی چاہئے۔ مگر ان سے بہت زیادہ جگہ وہ مٹی پلید ہو رہی ہے جو نہ ہونی چاہئے۔ میاں، ساس، خسر، نند، نندکے بچے، دیور، جیٹھ، انکی اولاد، غرض ان سب کو رضامند رکھنا اسکا فرض ہے۔ کوسنے، فضیحتیاں طعن و تشنیع اس کا انعام طلاق کا ڈراوا۔ دوسرے نکاح کی دھمکی اس کی خدمتوں کا صلہ۔ جن بیچاریوں نے کبھی خواب میں بھی محنت نہ کی تھی دن بھر پاپڑ بیلیں ایک ایک کا آگا تاگا۔ ایک ایک کی للو پتو۔ غرض زندگی کیا ہوئی وبال ہو گئی، پکاؤ، ریندھو، سیو، پروؤ، جھاڑو بہارو، لیپو پوتو، غرض گھل کر خاک اور جل جل کر کوئلہ ہو جاؤ مگر پھر کسی کے بھاویں نہیں۔ ہتے جانے والے پھوہڑ بتائیں، ملتے جلنے والے کیڑے ڈالیں۔ زبان دراز وہ، کام چورنی وہ، اجل جوگنی وہ، بدڈھنگی وہ، غرض کوئی ایسا عیب نہیں جو اعمال نامہ میں موجود نہ ہو، ناقص العقل اسکا ا

خطاب۔ بیوقوف اس کا لقب۔ مختصر یہ کہ کتّے کی زندگی اس سے بہتر ہے۔ جسکو موت کی کبھی تمنّا نہیں ہوتی۔ یہ بحث کہ جو بیویاں اپنے فرض ادا نہیں کرتیں کس سلوک کی مستحق ہیں۔ یا بیویوں پر شوہروں کے کیا حقوق ہیں آئندہ سہی ناشنوفتنی تو افسوس اس کا ہے کہ آج نوبت یہانتک پہونچی کہ بہت سے اللہ کے بندے بیویوں کے مقابلہ میں انسانیت ہی کھو بیٹھے۔ ہمارے خیال میں کسی شخص کی آئندہ زندگی برباد کرنے سے زیادہ نہ کوئی بڑا گناہ ہے نہ ظلم۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن یہ گل کھل رہے ہیں اور پھر مزہ یہ کہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں خوب کیا۔ کہیں مذہب کی آڑ کہیں ضرورت کا بہانا اگر اسلام کے یہ معنی اور انسانیت کی یہ صنعت ہے تو اس اسلام اور انسانیت دونوں کو سلام کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ الٰہی بچا یو اسلام کو ان لوگوں سے جو اس کی ہنسی اڑائیں۔

تعجب ہے کہ ان کا ایمان انکو کبھی ملامت نہیں کرتا اور وہ نہیں سوچتے کہ انکی اپنی تمام ضرورتیں پوری ہوں۔ مزے سے زندگی بسر کریں کسی قسم کا غم پاس آکر نہ پھٹکے۔ اچھے سے اچھا کھائیں بہتر سے بہتر پہنیں۔ عیش کریں آرام کریں غرض دنیا انکے واسطے جنت ہو مگر وہ بے گناہ روح جو ان ہی جیسی آدمی ان ہی جیسی ضرورتیں رکھنے والی ہے۔ محض انکی غفلت خود غرضی اور نفس پروری سے بدترین مخلوق ہو جائے اور ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچے کہ موت کی منتظر اور زندگی جیسی نعمت سے بیزار ہو۔

یہ ہم جانتے ہیں اور ہم کیا دنیا جانتی ہے کہ کیسا ہی ظالم اور کیسا ہی کٹر کیوں نہ ہو۔ مرد ہو، عورت ہو، سنگدل ہو، رحمدل ہو، ظلم کی سزا نیکی کا بدلہ دنیا میں نہیں ملتا۔ وہ شخص جو آپ چین کرتا اور مزے اُڑاتا پھرتا ہے اگر اس کی بیوی دکھ بھرے، مصیبت جھیلے اس کی بلا سے۔ اسکے پاس سوا اسکے ایمان کے کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کے کارنامے اسے سمجھا دے جب وہ ایمان ہی نہ رہا تو ڈر، حیا، لحاظ، انسانیت سب ختم ہوئے اسکی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں وہ کیوں سوچنے لگا کہ ایک مظلوم ایسی مظلوم جس کو میں نے کہیں کا نہ رکھا۔ جو سب کچھ مجھ پر سے لٹا بیٹھی جس نے دنیا کی سب سے بڑی نعمت زندگی مجھ پر نثار کر دی۔ جس کو دنیا میں خوش رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا مجھے میری وجہ سے تڑپ تڑپ کر دن اور بیٹھ بیٹھ کر راتیں بسر کر رہی ہے اسکو کیوں خیال آئے کہ یہ دہکتی ہوئی انگیٹھیاں یہ نرم نرم تکیے اور گرم گرم بچھونے مجھ پر حرام ہیں اس لئے کہ وہ رنج وغم کی شریک عمر بھر کی ساتھی دکھ درد کی رفیق جس سے نباہ کا وعدہ اور وفاداری کا اقرار تھا آج جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں ٹھنڈے کپڑوں میں گھڑیاں گن گن کر کاٹ رہی ہے۔

زندہ ہیں ایسی بہت سی اللہ کی بندیاں جو آنکھوں میں پلیں چاؤ چونچلوں سے پلیں مگر وہ ساری اللہ آمین میکہ ہی تک تھی ظالم شوہروں کے پتھر دل اور سخت ہاتھوں نے کوارپنے کے ساتھ ہی دنیا کی بہار ختم کر دی جو نگاہ

محبت بھری معلوم ہوتی تھی زہر میں بجھی نکلی جس دم سے قبر تک ساتھ دینے کی امیدیں تھیں طوطے کی طرح دیدے بدل گیا۔

وہ شوہر والی رانڈیں وارث رکھتی بے وارثیاں اور بیواؤں سے بدتر سہاگنیں اپنے دن پورے کر رہی ہیں اور ان کے پھوڑا دل جنھوں نے اندر ہی اندر رس رس کر ان کو قبر پی جھکا دیں ایک ایک صورت کو حسرت سے تک رہے ہیں دنیا ان کے لئے دوزخ ہے۔ اور کوئی اتنا نہیں کہ ان دکھیاریوں کی مدد کرے مگر یہ مصیبت سدا رہنے والی نہیں ایک زبردست مددگار کی توقع موجود ہے۔ دن اس کے انتظار میں گزر رہے ہیں اور راتیں اسکی راہ میں بیت رہی ہیں۔ قریب ہے کہ وہ سچا رفیق یا موت ان کی مصیبتوں کو ختم کردے۔ جس طرح میکے سے وداع ہو کر یہ سسرال آئیں اسی طرح سسرال سے رخصت ہو کر قبر میں پہونچیں گی۔ دنیا ان سے چھوٹ جائیگی مگر یہ ایسی یاد چھوڑ جائیں گی کہ دنیا کے سُننے والے ان کے نام سر آنکھوں پر رکھیں گے۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

آج کے دن کسی پر ظلم نہ ہو گا۔ مگر ہاں جو کچھ کرتے تھے اس کا بدلہ ملے گا۔

جو دنیا رنگ برنگ کے جلوے دکھا اور مزے مزے کی باتیں سنا رہی تھی بیوفا نکلی جس عمر پر بڑا بھروسہ اور پوری تقویت تھی پل مارتے میں ختم ہوئی۔ اور یوم الحساب سر پر آپہونچا۔ دنیوی حکومتیں چار دن کا دور دورہ تھا۔ آج اس

حقیقی بادشاہ کا راج ہے جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں اور جس کے فیصلہ کا اپیل ہے نہ مرافعہ۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے تاجدار سرنگوں کھڑے ہیں۔ اور ہوا کانوں میں یہ صدا گونج رہی ہے۔

یہ ہے وہ دن جس میں بدلہ دینے کا وعدہ تھا

ایک وسیع میدان مردوں عورتوں سے پٹا پڑا ہے۔ فریادیوں کے غول سے دفعتاً عورتوں کا ایک گروہ علٰحدہ ہوا اور ایک عورت نے یہ فریاد شروع کی۔

بادشاہوں کے بادشاہ بے وارثوں کے وارث بدنصیبوں کی فریاد سن اور دکھیاریوں کا فیصلہ کر، ہم ہیں وہ کمبخت جن پر دنیا کا عیش حرام اور جینا وبال ہوگیا اے سچے معبود عمر کی کوئی گھڑی اور زندگی کا کوئی لمحہ سکھ سے نہ گزرا۔ الہ العالمین شوہروں نے ہمیں دھوکا دیا۔ اور ہماری زندگی دوزخ کر دی۔ ان پیاروں سے جن کا جو ہم پر پروانہ تھے ایسے پنجرے میں قید کیا کہ عمریں سر ٹکراتے بسر ہوئیں دنیا کی کسی نعمت کا لطف اٹھانا ہمیں نصیب نہ ہوا۔ ہم نے ان شوہروں کی اطاعت میں کمی نہ کی، نوکروں سے زیادہ خدمت اور عزیزوں سے بڑھ کر محبت کی مر گئے۔ اور ان کی آن بان میں فرق نہ آنے دیا۔ کٹ جائے یہ زبان اگر ان کی شکایت کی ہو اور جل جائیں یہ ہونٹ اگر ان کو بددعا دی ہو۔ راتیں اس آرزو میں صبح اور دن اس امید پر شام کئے کہ ان کو ہماری حالت پر رحم آئے مگر اے آسمان و زمین کے بادشاہ ان کے مشغلوں نے انہیں اتنی

فرصت نہ دی کہ یہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے۔ ماں باپ جیسی نعمت عمر جیسی دولت، بے فکری جیسی راحت ان کی نذر کی، گھر چھوڑا بار چھوڑا برسوں کا رشتہ توڑا پیاروں سے منہ موڑا مگر اس کا پھل یہ ملا کہ سُلگ سُلگ کر دن کاٹے اور جھلس جھلس کر وقت گزارا یہ ہم کو عمر بھر رفیق رہنے کے وعدوں اور قبر تک ساتھ دینے کے اقراروں پر لائے مگر اے کمزور اور طاقتور دونوں کے مالک رات کی سیاہی میں کالا بھنور آسمان ہمارے سر پہ ہوتا۔ بجلی چمکتی بادل گرجتا چور آتے۔ دیواریں گرتیں دکھ ہوتے بیماری ہوتی اور یہ سنگدل جو آج تیرے حضور میں حاضر ہیں دیوار بیچ فرّے اُڑاتے اور ہم سے اتنا نہ پوچھتے کہ کیوں کر گزری اور کیا گزری۔ اے عدل حقیقی کا وعدہ کرنے والے حاکم عمر اس امید پر ختم کی ہے کہ آج تیرے دربار سے داد ملے گی۔ ہم مظلوموں کی حمایت لے اور وہ لوگ جو ہماری مصیبتوں پر ہنستے آج انہیں دکھا دے کہ جن کا کوئی نہیں ان کا تو۔ تو وہ جس کی تسبیح سمندر میں مچھلیاں، ہوا میں پرند، جنگل میں درند، زمین پر آدمی، آسمان پر فرشتے کرتے رہے۔ تو وہ جس کو ہم نے دنیا میں پوجا۔ آج دین میں ہمارے صبر کا اجر دے۔ ازلی اور ابدی تیرا راج آج وہ دن ہے کہ راجا پرجا، امیر فقیر، ظالم، مظلوم، بیگناہ، معصوم، شہ زور، کمزور سب تیرے فیصلے کا منہ تک رہے ہیں۔ دلوں کا حال جاننے والے بادشاہ رہ رہ کر ہوک اُٹھتی ہے۔

کن بے دردوں سے پالا پڑا انھا کہ خوشی کی صورت نام کو نہ دیکھی۔ اے بیکسوں کے والی تو گواہ ہے کہ فاقوں سے دن گزرے پاپیوندوں کی نوبت آئی۔ ایک ایک پیسہ ایک ایک اشرفی ہو گیا۔ بیماری کی راتیں پہاڑ ہو کر کٹیں مگر ان تیرے بندوں کا دل نہ پسیجا۔

سچے معبود ہمارے دُکھے ہوئے دل تیرے حضور میں فریادی آئے ہیں دِکھا دکھا۔ اے سچے معبود دکھا دے کہ مظلوموں کا وارث اور بیکسوں کا والی تو ہے۔

(۱۸) آثار عتیقہ

رعمیس ثانی فرعون مصر

(ابوالکلام آزاد)

مولوی ابوالکلام آزاد ملک کی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن پر تمام ہندوستان عموماً اور ادبی طبقہ خصوصاً فخر کر سکتا ہے۔ ان کے بزرگوں کا وطن دہلی ہے۔ مگر الہلال کی ادارت کے سلسلہ میں، ایک عرصہ تک کلکتہ میں قیام رہا۔ ابتدائی تعلیم ندوہ میں پائی اور مولوی شبلی نعمانی کے زیر سایہ ان کی تربیت ذوق ہوتی رہی۔ فقہ، حدیث، ادب عربی، اور دیگر علوم اسلامی میں انہیں بڑا تجربہ حاصل ہے۔ ہمیں ایک عالم، لیڈر، ماہر سیاست یا ایک خطیب کی حیثیت سے ان پر نظر ڈالنی منظور نہیں، ہمیں تو انہیں ایک ادیب کی حیثیت سے دیکھنا منظور ہے۔ ادبیات کے ذیل میں ان کی شخصیت یگانۂ روزگار اور ان کا طرز تحریر عدیم المثال ہے۔ اردو لکھنے کا جو طرز انہوں نے ایجاد کیا ہے وہ ان سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا تھا اور نہ بعد کو کامیابی کے ساتھ نقل کیا جا سکا۔ انکی انشا میں ایک ایسی علمی شان پائی جاتی ہے جو ہر مضمون کو ایک مستقل سرمایہ بنا دیتی ہے۔

ان کے جو اثرات معاصرین پر پڑے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہر طبقہ میں یہ احساس پیدا ہوگیا کہ اپنی زبان کا درجہ بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ صرف وقت و سنجیدگی کے ذریعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ہر چند یہ طرز تحریر، ادب لطیف فسانوں اور روزمرہ کی ضروریات کے لئے موزوں نہیں مگر فلسفہ، تاریخ، تنقید اور دوسرے علمی مباحث کی زبان یہی ہونی چاہیئے۔ یہ طرز تحریر اس اصول کے ماتحت اختیار کیا گیا ہے کہ بلند خیالات کے لئے دقیق زبان ضروری ہے۔ حضرت آزاد نے یہ طرز ایجاد کرکے اُردو کے دامن سے بے بضاعتی کا بدنما داغ دھو دیا اور یہ بتا دیا کہ اس زبان میں بھی علمی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ علوم و فنون جدیدہ اس میں آسانی کے ساتھ منتقل کئے جاسکتے ہیں اور یہ زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ترقی کرسکتی ہے۔ مولانا کی تحریر کی بہت سی خصوصیتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں الفاظ کے انتخاب میں بڑا کمال حاصل ہے۔ گو ان کے یہاں الفاظ دقیق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دقیق الفاظ کے بغیر سنجیدہ مطالب کا بیان کرنا محالات سے ہے مگر پھر بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں ثقیل یا غیر مانوس کہا جاسکے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ لفظوں کا استعمال اس خوبی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ مفہوم خود واضح ہوکر رہ جاتا ہے۔ شوکت الفاظ سے عبارت میں ایک مخصوص علمی شان پیدا ہو جاتی ہے اور جب یہ علمی اصطلاحیں جو اپنی ندرت کے اعتبار سے، سادہ زبان میں، اسی طرح علیحدہ نظر آئیں اور نمایاں رہیں جس طرح ململ میں گاڑھے کا پیوند، بالکل اس طرح

کھپ کر رہ جاتی ہیں کہ اصل عبارت کا جزو معلوم ہونے لگتی ہیں۔ غالب نے جو شان نظم میں پیدا کی ہے، ابوالکلام آزاد نے وہی شان نثر میں پیدا کر دی ہے۔ اس طرز تحریر کی ایجاد سے پہلے، اردو کے دائرے کو بہت تنگ و محدود بتایا جاتا تھا، اور یہ کہا جاتا تھا کہ یہ زبان ہر قسم کے خیالات کی حامل نہیں ہو سکتی۔ مگر مولانا نے یہ اتہام باطل کر کے دکھا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ اس قسم کے الزامات صرف اپنی ذاتی و انفرادی بے مایگی کی دلیل ہیں اور انہیں حقیقت سے کوئی سروکار نہیں۔ مولانا کے مضامین میں حقائق اور معانی کے جو خزانے بھرے ہوئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ اردو میں ہر قسم کی استعداد موجود ہے اور اہل بصیرت اس سے بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ وضع اصطلاحات اور مترادف الفاظ استعمال کرنے میں، انھیں خاص کمال حاصل ہے۔ آزاد، نذیر احمد، سرشار اور راشد الخیری کی طرح، مولانا ابوالکلام آزاد، ایک اسلوب کے موجد اور مالک ہیں جس کی نمایاں خصوصیات علمیت اور بلاغت ہیں اور اس کا اختراع زمانہ کی ضروریات کی بنا پر نہایت ضروری تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تقلید میں سادہ نگاری کا میلان روز بروز ترقی کر رہا تھا اور اگر ابوالکلام آزاد بر محل مدد نہ کرتے تو علمی تحریر کی ترقی ابھی ایک عرصہ تک ادھوری رہتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عرصہ تک الہلال نامی ایک ہفتہ وار اخبار کلکتہ سے نکالتے رہے جو اپنی نوع کا بالکل ایک نیا اخبار تھا۔ اس کے مضامین نے ملک میں ہلچل مچا دی اور اردو خواں پبلک میں اعلیٰ قسم کی ادبیت کا مذاق پیدا کر دیا۔ الہلال

ہیں جو مضامین مولانا کے قلم سے نکلے ہیں اردو زبان کا ایک غیر فانی گنجینہ ہیں۔ ان مضامین نے نہ صرف موجودہ زمانہ کی تربیت کی بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی اُن سے بیحد فائدہ پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے۔ مولانا کے تجر علمی سے بحث کرنے کا یہ محل نہیں مگر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ آپ آیات قرآنی اور ان کے مطالب کو جس طرح دلچسپ اور عام فہم بنا کر پیش کرتے ہیں وہ صرف آپ کا حصّہ ہے۔ مولانا کو اسلامی تمدن سے عشق ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں آپ کو کمال حاصل ہے۔

تصانیف۔ اتحاد اسلامی، احرار اسلام، الحرب فی القرآن، اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان، تازہ مضامین تذکرہ، تفسیر سورہ والتین، جہاد اور اسلام، حزب اللہ حقیقۃ الصلوٰۃ، حقیقت قربانی، دعوت حق، دعوتِ عمل، ذکریٰ، صدائے حق، سعادت صدرتنت، خطبات، مجموعہ مضامین، وغیرہ۔

ذیل کا مضمون الہلال سے لیا گیا ہے۔

علمائے آثار نے آج کل رعمسیس ثانی کی متعدد یادگاریں دریافت کی ہیں، جو فراعنہ مصر کے انیسویں خاندان کا تیسرا بادشاہ تھا۔ تورات کے سنین و اعمار کا حساب اگر کسی طرح غیر مشکوک ثابت ہو جائے تو رعمسیس کا زمانہ میلاد مسیح سے تقریباً ۱۴۰۰ برس پہلے، اور واقعہ ہجرت سے ۲۲۰۰ برس پہلے ہوگا یعنی یہ دریافت شدہ یادگاریں آج سے تین ہزار ۲۱۵ برس پہلے کی ہیں مگر علمائے فرنگ کی تحقیق ان کو بہت قدیم ثابت کرتی ہیں، کیونکہ رعمسیس

کا زمانہ ان کی رائے میں تورات کے ظن وتخمین سے منزا یدہے۔ اسی خاندان میں اسی بادشاہ (رعمسیس ثانی) کے بعد وہ (فرعون) تخت نشین ہوا تھا، جس کا واقعہ حضرت (موسیٰ) کے ساتھ تورات اور قرآن مجید میں تصریح مذکور ہے۔

رعمسیس ثانی جس کے عہد کی یادگاروں کا مرقع آج شائع کیا جاتا ہے، اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت کے اندر مصر میں نہایت کثرت سے عمارتیں تعمیر کرائیں، ملک فتح کئے، شہر آباد کئے، دشمنوں کی مدافعت کی، اور آثار پہ، جو وادئ نیل میں نہایت کثرت سے ابتک محفوظ ہیں، اس کا نام منقوش نکلتا ہے۔

رعمسیس اپنے باپ کے زمانہ میں جب ولی عہد تھا، تو ہمیشہ جنگ اور فتوحات میں مشغول رہتا تھا۔ تخت نشینی سے پہلے ہی اس کے کارنامے نہایت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ تخت نشینی کے بعد اس نے اور بہت سے عجائب و غرائب امور انجام دے۔ جس نے تاریخ مصر میں اسکی جگہ نہایت ممتاز کر دی ہے۔ ہیکل شمس کے کاہن نے رعمسیس کی ولادت سے پہلے بادشاہ سے پیشگوئی کی تھی، کہ یہ بچہ بہت بڑا بادشاہ ہوگا اور تمام دنیا پر حکومت کریگا۔ تخت نشینی کے بعد اس پیشگوئی کی خوشی میں رعمسیس نے اس ہیکل کی عمارت وسیع کر دی اور اس کی تعمیر میں بہت سے خوبصورت اضافے کرائے۔

رعمسیس نے آس پاس کی تمام قوموں کو زیر کر لیا تھا جیسں مختلف قومیں

اس کو خراج دیتی تھیں، سب سے پہلی بار عہد شہزادگی میں اس نے عربوں پر حملہ کیا، اور کہا جاتا ہے کہ ان کو اپنا مطیع بھی بنا لیا اس سے پہلے عرب کسی کے مطیع نہ تھے۔ گو یہ اطاعت بھی اسکی واپسی کے بعد قایم نہ رہی۔ عرب کے سوا دوسری طرف اس نے افریقہ میں برقہ وغیرہ کو فتح کر کے حکومت مصر میں داخل کیا۔ سوڈان بھی اس کے زمانہ میں مصر سے متعلق تھا۔ اور ہر سال بطور خراج ہاتھی دانت، آبنوس کی لکڑی، اور سونے کی ایک مقدار کثیر مصر کو ادا کرتا تھا۔

بڑی معرکہ آرائیوں کے علاوہ بحری معرکوں سے بھی اس کے کارنامے خالی نہیں۔ اس نے بحر احمر میں ایک بیڑا طیار کیا جس میں ۴۰۰ سے زائد جنگی جہاز تھے۔ ان کی مدد سے اس نے بحر احمر کے تمام سواحل پر جزائر بحر ہند تک قبضہ کر لیا۔ اور عین اس وقت، جب کہ اس کے افسران سواحل و جزائر پر قبضہ کر رہے تھے، خود رعمسیس ایک خونخوار فوج لئے ہوئے ایشیا کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرتا ہوا ایک ایک ملک فتح کرتا ہوا بالآخر ہندوستان تک پہنچا اور گنگا کو عبور کر کے بحر ہند سے نکل آیا۔

دوسری طرف ترکستان سے گزر کر وہ نہر طونہ (دریائے ڈینیوب) کو عبور کر گیا، واپسی میں یورپ کے بعض شہروں سے گزرتا ہوا روم ایلی میں داخل ہوا، اور جزائر بحر روم کو اپنی حکومت میں داخل کر لیا۔ یہ سفر رعمسیس کا آخری جنگی سفر تھا۔

عظمائے فاتحین میں رعمسیس ہی وہ شخص ہے جس نے شکست خوردہ اور منہزم قوموں سے نہایت لطف و مہربانی کا برتاؤ کیا۔ سیلسی مجرموں کی خطائیں بخشیں، مفتوح و مغلوب قوموں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیا، اور ان سے بہت تھوڑا سا خراج وصول کیا۔ وہ رعایا کے اعتقادات و مذاہب کا بڑی فراخ دلی سے لحاظ کرتا تھا۔

تعمیر کا کام قیدیوں سے لیتا تھا، لڑائیوں میں جو قیدی ہاتھ آتے تھے، وہ مصر لاکر تعمیر کے کام میں لگائے جاتے تھے۔ اس کو فن تعمیر سے بہت شوق تھا۔ دو شہروں کی تزئین و آرائش میں خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی۔ ایک تو منفت سے جو اس زمانہ میں مصر کا پایہ تخت اور دوسرے طیرہ سے جو مصر کا مذہبی مقدس شہر تھا۔ انہیں قیدیوں کے ذریعہ اس نے مصر میں بہت سے پل بھی تعمیر کرائے و نیز تجارت و زراعت کی ترقی کیلئے اس کے بہت سی نہریں کھدوائیں کہ دریائے شور (سمندر) تک راستہ ایک ہو جائے۔

خاندانی حسد و نفاق قدیم حکومتوں کی خاص ترین امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ رعمسیس جب اپنے عظیم الشان فتوحات کے بعد مصر واپس آرہا تھا۔ اس کا بھائی اس کے استقبال کو مصر کے شہر تنیس تک آیا اور نہایت تپاک سے اس سے ملا۔ رات کو جب رعمسیس مع اپنے اہل و عیال کے سو رہا تھا، اس کے بھائی نے مکان میں آگ لگا دی رعمسیس مع اہل و عیال بڑی مشکل سے

اس مصیبت سے نجات پا سکا۔ اس کے بھائی کو جب اپنی ناکامیابی کا حال معلوم ہوا تو بھاگ کر یونان چلا گیا، اور وہاں مصری قوم کی ایک نو آبادی قایم کر دی۔ آثار یونان میں اس کا نام دانوس مصری بیان کیا جاتا ہے۔

رعمسیس کو ان عظیم الشان کامیابیوں نے نہایت مغرور و متکبر بنا دیا تھا جو سلاطین اسیر ہو کر اس کے ساتھ آئے تھے ان سے نہایت سخت تحقیر سے پیش آنے لگا، اور روز و شب سوائے فخر و غرور و تقدیس ملغیان و تذکرہ فتوحات، اس کا کوئی کام نہ رہا۔ آخر بشریت سے منزہ ہو کر وہ ایک اور عالم کا مخلوق اپنے کو سمجھنے لگا، پس خدا کا قانون، جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا، جاری ہوا اور نہایت اہانت و تحقیر کے ساتھ خود اپنے ہاتھ سے خودکشی کر کے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(۱۹) عربوں کا تمدن زمانہ جاہلیت میں

(سید علی بلگرامی)

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی، ایک نہایت معزز خاندان سے تھے اور بلگرام کا خطہ مردم خیز ان کا وطن تھا۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لئے ہمیشہ مشہور و ممتاز رہا اور سوسائٹی میں وقعت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ سید علی نے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اپنی قابلیت کا ثبوت دینا شروع کر دیا تھا۔ آخر کار سر سالار جنگ نے انہیں یورپ بھجوایا۔ اور وہاں جاکر انہوں نے اور بھی زیادہ امتیاز حاصل کیا۔ یہ اپنے زمانہ کے بڑے زبردست عالم تھے اور فارسی، عربی اور سنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ یورپ کی بہت سی قدیم اور جدید زبانوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ بنگلہ، مرہٹی اور تلیگو بھی جانتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ ہمیں انکی حیات کے اس حصہ سے جو حیدرآباد، انگلستان اور ہندوستان میں بسر ہوا کچھ زیادہ دلچسپی نہیں کیونکہ اس کا ادب اردو سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ سید علی بلگرامی مشہور فرانسیسی مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کی مشہور تصانیف تمدن عرب اور تمدن ہند کے اردو میں ترجمہ کرنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے میڈیکل جورسپروڈنس کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اپنے ادبی مشاغل کے علاوہ وہ علی گڈھ کالج کے معاملات میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔

ان دو کتابوں نے سید علی بلگرامی کو اس عہد کے ارباب قلم کی صف میں جگہ بخشدی ہے ان کتابوں سے مترجم کے تبحر علمی، زبان دانی، اور موضوع تاریخ سے کما حقہٗ واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل کا مضمون تمدن عرب سے ماخوذ ہے

توراۃ کے مختلف ابواب میں عربستان کی تجارت اور شہروں کا علی الخصوص سبا ے یمن کا ذکر موجود ہے۔ ان بیانات سے ہمیں اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدیم الایام میں بڑے بڑے شہر تھے لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے اخبار ہمیں نہیں ملتے۔

تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح ہیرودوطس نے یمن کے ملک کو تمام دنیا کے ملکوں سے زیادہ زرخیز لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ مارب میں جو زمانہ قدیم میں سبا کے نورات کا قایم مقام تھا بڑے بڑے عالی شان قصر تھے جن کی محرابیں سنہری تھیں اور ان کے اندر طلائی اور نقرئی ظروف اور بیش بہا پلنگ سونے اور چاندی کے موجود تھے۔

اسٹرابو بھی اس قسم کے اخبار لکھتا ہے ارتمیدوس کے قول کی نقل کر کے وہ کہتا ہے کہ مارب ایک عجیب و غریب شہر تھا۔ شاہی قصروں کی چھتیں سونے اور ہاتھی دانت اور بیش بہا موتیوں سے مرصع تھیں۔ اور حجروں کا اسباب نہایت باریک ترشا ہوا اور پاکیزہ تھا۔ اراتسطین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکانات مصریوں کے مکانات سے مشابہ تھے۔ اور ان میں لکڑی کا

کام مصری مکانوں کا سا تھا۔

عربوں کی قدیم روایات سے بھی ان بیانات کی تصدیق ہوتی ہے اور کل مورخین عرب یمن کی تعریف میں یک زبان ہیں۔ حوالی مارب کے بیان میں مسعودی لکھتا ہے "ہر طرف خوبصورت عمارتیں سایہ دار درخت بڑی بڑی نہریں اور آب رواں کی آبشاریں نظر آتی تھیں۔ اس ملک کی وسعت اس قدر تھی کہ اس کے طول اور عرض کو ایک اچھا سوار ایک مہینہ کی مدت میں قطع کرتا تھا۔ مسافر خواہ پیدل ہو یا سوار بلا دھوپ میں چلے ہوئے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتا تھا کیونکہ اس مملکت میں درخت اس کثرت سے راستوں کے دورویہ لگائے گئے تھے کہ ان کا سایہ کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ رعایائے ملک کو ہر قسم کا لطف زندگانی حاصل تھا۔ مایحتاج زندگی بکثرت موجود تھیں۔ زمین سیر حاصل، ہوا صاف، آسمان شفاف پانی کے چشمے بکثرت، حکومت عالی شان، سلطنت مستقیم اور قوی، ملک نہایت ترقی اور سرسبزی کی حالت میں، یہ وہ نعمتیں ہیں جن سے یمن کا چین و آرام ضرب المثل ہو گیا تھا۔ یہاں کے باشندوں کی عالی حوصلگی اور ان کا فطرتی اخلاق اور ہر ایک وارد و صادر کے ساتھ ان کی مہمان نوازی مشہور زمانہ تھی۔ ملک کی یہ اقبال مندی اس وقت تک قایم رہی جبتک مرضی اللہ جل شانہ تھی۔ جس بادشاہ سے مقابلہ کیا زبر ہوا جس ظالم نے فوج کشی کی اس نے شکست پائی

کل اقطار اُن کے زیر حکومت تھے اور کل اقوام اُن کے تابع فرمان۔
غرض یمن کا ملک سرتاج عالم تھا۔"

یمن کے اس خطے کی آبادی کا باعث عرم مارب معلوم ہوتا ہے مورخین عرب لکھتے ہیں کہ اس بند کو اُسی بلقیس نے تعمیر کیا تھا جو حضرت سلیمانؑ سے ملنے کو آئی تھی۔ یہ بند ایک بہت لمبی گھاٹی کے منفذ پر بنایا گیا تھا چاروں طرف سے پہاڑوں کا پانی آکر اس گھاٹی میں سے ندی کی طرح بہتا تھا اور بند نے اس پانی کو روک کر ایک بڑا سا تالاب بنا دیا تھا جس سے تمام ملک میں آبپاشی ہوتی تھی یہ بند سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں ٹوٹ گیا اور اس کے ٹوٹنے سے وہ تمام خطہ ویران ہو گیا۔

جن اسناد کا اوپر ذکر ہوا اُن میں باہمی اس قدر تطابق ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یمن میں اس قسم کے آباد اور آراستہ شہر موجود تھے جیسے مصر قدیم میں تھے اور ان کا تمدن اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ان کی عمارات و ابنیہ اس وقت گرد روزگار کے نیچے پڑی سو رہی ہیں اور جیسا کہ بابل اور نینوی کے ویرانوں نے برسوں انتظار کیا یہ بھی کسی آثار قدیمہ کے محقق اور متجسس کا انتظار کر رہی ہیں۔

یمن کے بڑے بڑے شہروں کا پرتکلف اور اسباب عیش و عشرت سے مملو ہونا اس ملک کی قدامت اور تجارت کی وسعت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثال بمشکل ملے گی کہ کسی قوم نے بڑے بڑے تجارتی تعلقات پیدا کرے

ہوں اور اُس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی نہ ہو۔ فی الواقع عربوں کی تجارت اقصائے ربع مسکوں تک پہنچ گئی تھی اور یہ تجارت ان کی اس قدر قدیم ہے کہ خود توراۃ میں اسکا ذکر موجود ہے۔ دو ہزار سال تک عرب تمام عالم کے مرکز تجارت بنے رہے اور زمانہ قدیم میں انہوں نے وہی کام دیا جو یورپ میں وینس نے اپنی ترقی کے زمانہ میں دیا تھا۔

زمانۂ قدیم میں عربوں ہی کی بدولت یورپ کے تعلقات اقصائے ممالک ایشیا کے ساتھ قائم رہے۔

عربوں کی تجارت محض عربستان کی پیداوار تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ان اجناس کی تجارت کرتے تھے جو افریقہ اور ہندوستان سے آتی تھیں۔ اُن کی تجارت اکثر ان اشیا کی تھی جو سامان عیش و عشرت میں شامل ہیں مثلاً ہاتھی دانت، مصالحات، خوشبو، عطریات، جواہرات، سونے کا سفوف، لونڈی غلام وغیرہ وغیرہ۔ بہت دنوں تک یہ تجارت فنیقی فنیقین کے ذریعہ سے جن کی زبان عربی سے بہت مشابہ تھی ہوا کی۔ یہ لوگ سامان تجارت لاکر اپنے بڑے شہروں میں جن میں سے ایک قور تھا جمع کرتے تھے اور پھر وہاں سے اُسے تمام عالم میں پھیلاتے تھے۔

ہندوستان کی تجارت میں عربوں کے رقیب اہل بابل تھے۔ ان کا تعلق ہند سے خشکی کی راہ یا خلیج فارس کی طرف سے تھا۔ تجارت کا

مال بابل سے شام کو آتا اور وہاں سے تمام عالم میں تقسیم ہوتا۔ جو کاروان اس راہ دور و دراز سے آتے اُن کے راستے میں ہیلیو پولس (قدیم بعلبک) اور پلمیرہ کی تجارت گاہیں جنکے آثار قدیمہ اس وقت بھی تعجب انگیز ہیں اور نیز دوما کا مشہور شہر پڑا کرتا تھا۔

جب کہ عربوں کے تجارتی تعلقات اس قدر وسیع تھے اور اس زمانہ دراز تک قایم رہے تھے تو ہم خیال کر سکتے ہیں کہ عربستان اور علی الخصوص یمن کے بڑے بڑے شہر اس زمانہ میں کیسے ہونگے۔ اس وسیع تجارت کی بدولت وہ عیش و عشرت کی تمام ضرورتوں سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ اور مورخین یونانی و رومی و عرب کا اُن کے عظیم الشان شہروں کے عجائبات بیان کرنے میں ایک زبان ہونا بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔

لیکن اعراب جاہلیت کے تمدن کا جلوہ فقط یمن ہی میں نہیں تھا اور سلطنت حیرہ و غسان کے جو کچھ حالات مورخین قدیم نے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعراب جاہلیت میں جو بہت جلد دائرہ اسلام میں آنیوالے تھے کس قدر ترقی کا مادہ موجود تھا۔

حیرہ کا ذکر تو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یہ ایسا مشہور شہر تھا کہ آراستگی و خوبی میں دار السلطنت ایران اور قسطنطنیہ کا مقابلہ کرتا تھا غسان کی سلطنت بھی ویسی ہی باوقعت تھی جیسی حیرہ کی۔ اس کی بنا ڈالنے والے وہ عرب تھے

جو یمن سے آئے تھے۔ اور یہ سلطنت اوائل سنہ مسیحی میں قائم ہوئی تھی اور پانسو برس تک رہی تھی۔ آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات نے ان کی ترقی کی عظمت کو ثابت کر دیا ہے اور جو عمارت و ابنیہ اس وقت کی حدود شام میں بصرہ کے قریب (جو ان کا قدیم دارالسلطنت تھا) نکلی ہیں وہ نہایت عظیم الشان سبائی کتبوں سے لسی ہوئی ہیں۔ ان عمارات کی طرز تعمیر رومیوں کی طرز سے بالکل علیحدہ ہے۔ اسی نواحی میں ایک سلسلہ نہروں کا نکلا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں بڑے بڑے کاموں کے انجام دینے کی صلاحیت موجود تھی۔

یہ بھی لحاظ کے لائق ہے کہ حیرہ اور غسان میں عربوں کو ایرانیوں اور رومیوں سے سابقہ تھا اور ان کے تمدن پر بلاشک ان اقوام کا اثر پڑا ہوگا۔ برخلاف اس کے یمن کی ترقی بالکل رومیوں سے علیحدہ تھی اور یہاں خالصاً عربی تمدن تھا اور اسی وجہ سے عربوں کے پرانے تمدن کا پتہ زیادہ تر یمن میں ملسکتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ تحقیقات آثار قدیمہ ابھی یمن تک نہیں پہنچی ہیں۔ اور آج بھی یمن کے قدیم شہروں کی حالت سے ہم اسی قدر ناواقف ہیں جیسا کہ ہم چند سال قبل اسیریا کے ان شہروں کی حالت سے ناواقف تھے جو اس وقت ریتی میں دبے ہوئے تھے۔ جہاں تک ظاہری علامات سے استنباط ہو سکتا ہے یقین ہے کہ یمن میں آثار قدیمہ کی تلاش ضرور سرسبز ہوگی

موسیو ہاویلی جو چند سال قبل یمن کے ملک سے گزرے لیکن کسی مقام کو کھود نہ سکے لکھتے ہیں کہ اس وقت بھی اکثر عرب سونے اور چاندی کی اشیاء ویرانوں میں پاتے ہیں اور خود اس سیاح کو حرم قریب جو صنعاء کے پاس ہے پتھر کے ستون ملے ہیں جن پر قدیم کتبے کندہ تھے۔ اور نیز ایک سبائی عبادتگاہ کا دروازہ مسطح پتھر کا بنا ہوا ہے جس پر حیوانات اور نباتات کی صورتیں کندہ ہیں۔ موسیو شلمبر گرنے قسطنطنیہ میں ایک مجموعہ دو سو سکوں کا خریدا جو قدیم بادشاہان یمن کے سکے کچھ دنوں قبل مسیح کے ہیں۔ یہ سکے ایک عرب نے صنعاء میں پائے تھے اور اس واقعہ سے پہلے یہ نہایت درجہ کمیاب تھے کیونکہ کل یورپ کے عجائب خانوں میں دو یا تین سے زیادہ نہ تھے یہ سکے نہایت عجیب صورت کے ہیں۔ ایک طرف کسی بادشاہ کا چہرہ یک رخی بنا ہوا ہے سر پر تاج ہے اور بالوں کی لڑیں بالکل ویسی ہیں جیسی خاندان ہکساس کے مصری سلاطین راعیہ کی جو حقیقت میں عربستان سے مصر گئے تھے اور مدتوں بادشاہ رہے تھے۔ موسیو میاریٹ کو اس خاندان کے بادشاہوں کی مورتیں ملی ہیں جو اس وقت بولاق کے عجائب خانہ میں موجود ہیں سکے کے دوسری طرف ایک الّو کی تصویر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سکوں کا ماخذ وہ یونانی سکے ہیں جو اس وقت بحر متوسط کے ان کل اقوام میں بکثرت پائے جاتے ہیں جنکے تجارتی تعلقات عربوں کے ساتھ تھے۔

یہ آثار قدیمہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ اگرچہ ناکافی ہیں لیکن ان سے مورخین قدیم کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں عرب ستان میں ایک نمایاں تمدن تھا جو اب مفقود ہو گیا ہے لیکن منتظر وقت و موقع ہے۔ جو کچھ مختصر حالات ہمیں معلوم ہیں اُن سے ہم اتنا نتیجہ بالیقین نکال سکتے ہیں کہ جس قوم نے کئی صدی رومیوں کے ظہور سے پہلے بڑے بڑے شہروں کی بنا ڈالی اور دنیا کی بڑی اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کئے اُس قوم کو ہم ہرگز وحشی اور غیر مہذب نہیں کہہ سکتے۔

(۲۰) اصول اصطلاح سازی

(وحید الدین سلیم)

مولوی وحید الدین سلیم، عہد حاضر کے ایک مشہور ادیب ہیں۔ انکے والد کا نام حاجی فرید الدین ہے۔ ان کا خاندان ہمیشہ نہایت معزز رہا۔ انکا خاندان جب ہندوستان میں وارد ہوا تو پانی پت میں سکونت اختیار کی اور ان کے والد بو علی شاہ قلندر کی درگاہ کے متولی مقرر ہوئے۔ سلیم نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں پائی اور پھر لاہور جاکر عربی، فارسی میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ ان کا ارادہ وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا تھا مگر چند روز بعد یہ خیال ترک کر دیا اور ریاست بہاول پور میں محکمۂ تعلیمات میں ملازمت اختیار کرلی۔ اسکے بعد کچھ روز رام پور میں رہے۔ پھر چھ سال تک بیمار رہنے کے بعد پانی پت میں طبابت کا پیشہ شروع کیا۔ حالی نے ان کا تعارف سرسید سے کرایا۔ چنانچہ وہ اُن سے مل کر اور ان کے علم و فضل کا حال معلوم کرکے بہت خوش ہوئے۔ اب انہوں نے سرسید کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور مرتے دم تک انکے ساتھ رہے۔ اسکے بعد انہوں نے رسالہ معارف جاری کیا جو کچھ عرصہ تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ نواب محسن الملک کے کہنے سے انہوں نے علیگڑھ گزٹ کی ادارت قبول کرلی مگر علالت کی وجہ سے اسے خیرباد کہنا پڑا۔ سلیم مسلم گزٹ لکھنو

کے بھی ایڈیٹر رہے مگر مسجد کانپور اور اس کے متعلق بلوؤں کے بارے میں انہوں نے نہایت پرجوش مضامین نکالے اس لئے مجبوراً انہیں اس جگہ سے علٰحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد یہ زمیندار کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر پرچہ کی بے اعتدالیوں کے باعث ضمانت ضبط ہوئی اور سلیم کو بھی اپنے تعلقات قطع کرنا پڑے۔ اب تک سلیم کی شہرت حیدرآباد پہنچ چکی تھی، چنانچہ وہاں سے انہیں دعوت دی گئی اور بلا کر دارالترجمہ میں متعین کیا گیا۔ یہاں انہوں نے اپنی مشہور کتاب وضع اصطلاحات تصنیف کی عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام پر سلیم کو پہلے اسسٹنٹ پروفیسر اردو مقرر کیا گیا اور چار سال بعد پروفیسر کر دیے گئے۔

ایک انشا پرداز کی حیثیت سے سلیم کا درجہ بہت بلند ہے۔ انکی نمایاں خصوصیات سادگی، صفائی، سلاست اور قوت بیان ہیں۔ کبھی کبھی انکی تحریر جذبات سے بہت متاثر نظر آتی ہے اور اس وقت فصاحت پوری قوت سے صرف ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے انکے مضامین، معارف علیگڈھ، تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڈھ۔ علیگڈھ منتھلی اور اردو حیدرآباد میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے مضامین، تلسی داس کی شاعری، اردو مائی تھولوجی اور عرب کی شاعری، خصوصیت کیساتھ دلچسپ اور مفید ہیں۔ سلیم نے عرصہ تک فن انشاپردازی کو کسب کیا ہے۔ اس لئے ان کی تحریر میں اب وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انتی مشق کے بعد پیدا ہوجانی چاہیئں۔ انکی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ یہ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ قطعی استعمال نہیں کرتے بلکہ حالی کی طرح خوبصورت ہندی الفاظ کام میں لاتے ہیں اور انہیں خوبی کے ساتھ کھپا دیتے ہیں۔

ذیل کا مضمون وضع اصطلاحات کے مقدمہ سے ماخوذ ہے۔

اصطلاح کی ضرورت کیا ہے؟ اصطلاح کی ضرورت ایسی نہیں جس سے لوگ آگاہ نہوں۔ اگر اصطلاحیں نہوں، تو ہم علمی مطالب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور انکو بار بار دُھرانا پڑتا ہے۔ لکھنے والے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کی مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ اصطلاحیں وضع کرنے سے حافظہ پر بار پڑتا ہے۔ سہولت اسی میں ہے کہ ہر اصطلاح سے جو معنی مطلوب ہیں وہ تشریح و تفصیل کیساتھ بیان کردیے جائیں۔ مگر ایسا کرنے میں بھی دقت ہی کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا وقت ضائع ہوتا ہے اور کاغذ کا صرفہ جدا ہوتا ہے۔ حافظہ پر بار پڑنے کی شکایت جو اُن حضرات نے کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ جو شخص کسی علم یا فن کو سیکھنا چاہتا ہے بس اُسی علم یا فن کی اصطلاحیں آسے یاد کرنی پڑتی ہیں اُس سے یہ باز پرس نہیں کیجاتی کہ وہ تمام علوم و فنون کی اصطلاحیں کیوں نہیں جانتا۔ یورپ میں بھی جہاں تعلیم عام اور جبری ہے کوئی شخص ایسا نہیں ملیگا جو دنیا بھر کے علوم و فنون کی اصطلاحیں ازبر رکھتا ہو۔ ہر صاحب فن صرف اپنے فن کی اصطلاحات اور اس فن کی معلومات سے آگاہ ہوتا

اصطلاحات پر کیا موقوف ہے اگر آپ عام زبانوں پر غور کریں تو ہر لفظ ایک آوازی اشارہ ہے، جو خیالات کے ایک بڑے مجموعے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لفظوں کے بنانیکی ضرورت ہی اس بنا پر پیش آئی ہے کہ خیالات کے مجموعوں کو بول چال میں بار بار دُہرانا نہ پڑے تاکہ بولنے والے اور سننے والے کا وقت ضائع نہ ہو اور ایک شخص کا مافی الضمیر دوسرے شخص کے دل میں آسانی سے اُتر جائے۔

اِن آوازی اِشاروں سے جنکے مجموعے کا نام زبان ہے۔ بلاشبہ حافظہ پر کسی قدر بار پڑتا ہے، مگر یہ تھوڑی تکلیف اس بڑی تکلیف سے بچنے کیلئے گوارہ کی گئی، جو اعضائی اشاروں سے کام لینے میں برداشت کرنی پڑتی تھی۔ جب زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی تو آوازوں کی جگہ اعضائی اشاروں سے کام لیا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنے دل کا مطلب دوسرے شخص کو سمجھانیکے لئے ہاتھ پاؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے کام لیتا تھا یہ اشارے عجیب و غریب اور مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ بالن ایشیا کی جزائر میں بعض وحشی قومیں اب بھی ایسی موجود ہیں جو آوازوں کی جگہ ایسے اشاروں سے کام لیتی ہیں بات چیت کرنیکے وقت ان سے عجیب عجیب حرکات ظہور میں آتی ہیں جن جزائر کی وحشی قوموں میں آوازیں پیدا ہو گئی ہیں، ان میں اشاروں کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ آوازوں یا لفظوں کی ترقی سے اعضائی اشارات بتدریج کم ہونے گئے ہیں جن قوموں کی زبان میں نسبتاً الفاظ زیادہ ہیں وہ بمقابلہ ان قوموں کے جنکی زبان میں لفظوں کی کمی ہے، اعضائی اشارات کا استعمال بہت کم کرتی ہیں چونکہ آوازی

اشاروں میں اعضائی اشاروں کی نسبت بہت کم تکلیف ہے اسلئے الفاظ کی تعداد زبانوں میں رفتہ رفتہ بڑھتی گئی ہے اور انکے یاد رکھنے کی کوشش برابر ہوتی رہی اس کا انجام یہ ہوا کہ الفاظ کے یاد رکھنے میں حافظہ پر جو بار پڑتا تھا وہ بھی متواتر یاد کرنیکی مشق سے کم ہوتا گیا اور خود حافظے بھی قوی ہوتے گئے۔ چنانچہ مورخوں نے بیان کیا ہے کہ دنیا کی وہ قدیم قومیں جو سنسکرت، لاطینی، یونانی اور عربی زبان بولتی تھیں انکے حافظے بمقابلہ دیگر ہمعصر اقوام کے نہایت قوی تھے۔ یہ وہ زبانیں ہیں جن میں الفاظ کی تعداد بمقابلہ دیگر قدیم زبانوں کے بہت زیادہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ اسلئے ایجاد کئے گئے تھے کہ اعضائی اشاروں میں جو سخت تکلیف ہوتی تھی اس سے بچیں۔ الفاظ کے یاد رکھنے میں بیشک حافظہ پر بار پڑتا تھا مگر یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے کم تھی۔ اسلئے خوشی سے برداشت کیگئی۔ پھر لفظوں کے یاد رکھنے کی متواتر کوشش سے حافظہ کا بار بھی کم ہو گیا اور اس مشاقی سے خود حافظہ طاقتور ہو گیا۔ پس لفظوں کی افزائش سے حافظے پر بار پڑنیکی شکایت کسی طرح معقول نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو یہ تکلیف بمقابلہ اس تکلیف کے بہت ہی کم ہے جو لفظوں کے نہونیکی صورت میں ہمکو برداشت کرنی پڑتی۔ دوسرے موجودہ صورت میں خود حافظہ کی مشق اور اسکی تقویت متصور ہے۔

اسکے علاوہ ہمکو ایک اور اہم بات پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ الفاظ معلومات پر دلالت کرتے ہیں اور الفاظ کی بہتات معلومات کی بہتات پر دلالت کرتی ہے پس جس قوم کی زبان میں الفاظ کی تعداد کثیر ہے۔ اسکی معلومات کا دائرہ بھی بمقابلہ اس قوم کے جسکی زبان میں الفاظ کی قلت ہے نہایت وسیع ہوگا۔ اس بنا پر پہلی قوم بمقابلہ دوسری قوم کے

لازمی طور پر زیادہ مہذب ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حضرات ان الفاظ کی افزائش کے شاکی ہیں اور حافظہ پر بار پڑنے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ گویا اپنی قوم کو تہذیب و تمدن سے بھگاتی اور وحشت و بربریت کی طرف گھسیٹ کر لیجانا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو ترقی کی بلندی سے نیچے اتار کر تنزل کے غار میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔ ان حضرات کو سوچنا اور سمجھنا چاہئے کہ زندگی اور تمدن کی ضروریات ہی الفاظ کو عدم سے وجود میں لاتی ہیں۔ گانوں میں تمدن کی ضروریات کم ہیں۔ اسلئے گانوں کے رہنے والے کم و بیش دو سو الفاظ سے اپنا کام چلا لیتے ہیں، مگر جب ان کو شہروں میں آنا پڑتا ہے اور شہریوں سے معاملہ کرنیکی ضرورت پیش آتی ہے تو ضرورتاً انکے الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے اور اب تین چار سو الفاظ کے بغیر انکا کام نہیں چل سکتا۔ گانوں والوں کی نسبت شہر والوں کی ضروریات زندگی زیادہ ہیں، اسلئے انکی زبان میں الفاظ کی تعداد کہیں بڑھ کر ہے اور گانوں والونکی زبان کو شہر والونکی زبان سے کچھ نسبت نہیں۔ پھر بڑے شہروں، دارالسلطنتوں، تجارتی منڈیوں، صنعتی کارخانوں اور علمی مرکزوں میں زندگی بسر کرنیوالونکی ضروریات تمدنی اور بھی زیادہ ہیں۔ انکو لازمی طور پر الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا پڑتا ہے اگر یہ لوگ معترض حضرات کی طرح اپنے حافظہ پر بار ڈالنا نہ چاہیں، تو انکو چاہئے کہ ان بڑے تمدنی مرکزوں سے بھاگیں اور عام شہروں میں زندگی بسر کریں۔ پھر اگر عام شہری باشندے حافظہ پر بار ڈالنے سے بچنا چاہیں تو انکو لازم ہے کہ وہ دیہات میں جا کر آباد ہوں۔ اسی طرح اگر دیہات کے باشندوں کے دماغ دو تین سو

الفاظ کے بوجھ کا بھی تحمل نہ کرسکیں، تو پھر انکے لئے پالن ایشیا کے ان جزیروں میں سکونت اختیار کرنا موزوں ہوگا۔ جہاں آوازی اشاروں یعنی الفاظ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم شائستہ اور مہذب قوموں کی صف میں داخل ہونا چاہتے ہیں، اور اگر ہم علوم و فنون حاصل کرنا، زندگی کا اہم مقصد جانتے ہیں، تو زبان میں جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافہ سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیئے، کیونکہ ترقی کے لئے اس کا بوجھ برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

وضع اصطلاحات کے خلاف ایک نئی رائے

بعض بزرگوار ہیں، جو وضع اصطلاحات کی ضرورت تو تسلیم کرتے ہیں مگر اصطلاح سازی کے خلاف ایک نئی رائے رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ الفاظ جو پہلے بن چکے اور پھیل کر مقبول ہو چکے ہیں، انکے بنانیوالوں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ انکے نزدیک صرف ایسے ہی الفاظ زبان میں داخل ہونے اور تسلیم کئے جانیکی قابلیت رکھتے ہیں۔ جنکے وضع کرنیوالوں کے نام معلوم نہ ہوں۔ اگر کوئی خاص آدمی کوئی نیا لفظ وضع کرے تو وہ لفظ زبان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ بزرگوار اگر ذرا بھی تحمل فرماتے تو یہ بات انکے ذہنوں پر ضرور منکشف ہو جاتی کہ ہر زبان میں جو الفاظ بنائے جاتے ہیں، انکے بنانیکے وقت تمام قوم ایک جگہ مجتمع ہو کر ان الفاظ کو وضع نہیں کرتی۔ اول کوئی خاص آدمی کسی خاص لفظ کو وضع کرتا اور اسکو استعمال کرتا ہے۔ پھر اگر وہ لفظ اس معنی پر صاف اور روشن طور سے

دلالت کرتا ہے جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے اور قواعد زبان کے خلاف بھی نہیں ہوتا تو اور لوگ بھی رفتہ رفتہ اس کو مقبول کرکے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ شخص واضع کی شخصیت سے عام لوگوں کو کوئی بحث نہیں ہوتی اسلئے عموماً اُسکی شخصیت فراموش کردی جاتی ہے اور کسی کو یاد نہیں رہتا کہ اس لفظ کو کس شخص نے اول وضع کیا تھا۔ عام لوگوں کی نظر صرف اس ضرورت پر رہتی ہے جسکے لئے لفظ بنایا جاتا ہے اگر وہ ضرورت لفظ موضوع سے پوری ہوتی اور وہ لفظ آسانی سے زبان پر نہ چلتا ہو تو اسکے رد کرنے میں دیر نہ ہوتی۔ وہ یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ لفظ کا بنانیوالا کون ہے اور اس تحقیقات کی ضرورت انکو کبھی پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے عام الفاظ کی تاریخ معلوم نہیں ہوسکتی مگر علمی الفاظ میں سے بہت الفاظ ایسے ہیں جنکی تاریخ معلوم ہوسکتی ہے اور جنکے وضع کرنیوالوں کے نام بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ بزرگوار ذراسی تکلیف برداشت کریں اور ویبسٹر ڈکشنری کو ملاحظہ فرمائیں تو انگریزی زبان کے علمی الفاظ کی بہت سی ایسی مثالیں انکو معلوم ہوجائیں گی۔ آج یورپ کے علماء میں کوئی شخص ایسا نہیں ملیگا جو ان علمی الفاظ کو جنکی تاریخ اور جنکے واضعوں کے نام معلوم ہیں قبول نہ کرتا ہو اور محض اس بناء پر رد کردیتا ہو کہ انکی تاریخ مجہول نہیں ہے۔

اردو زبان مسخ کرنیکی تجویز ان عجیب و غریب خیال رکھنے والے بزرگواروں سے جو اصطلاحات کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں مگر اصطلاح سازی کے مخالف ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ اصطلاحات کی ضرورت تو مسلم ہے مگر جدید الفاظ کا بنانا آپکے نزدیک

ممنوع ہے تو پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کی تدبیر کیا کی جائے، اس کا جواب حضرات مذکور یہ دیتے ہیں کہ انگریزی زبان کے الفاظ ایسے کرخت اور ثقیل ہیں کہ ہماری زبانوں پر آسانی سے رواں نہیں ہو سکتے تو اسکے جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ تم ان الفاظ کو بازاریوں اور جاہلوں کے سامنے بولو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ ان الفاظ کو دہرائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ الفاظ مذکور کو کما ینبغہ نہیں بول سکتے پس ضرور ہے کہ ان میں تغیر و تبدل کریں اور انکو اپنی زبان کی خراد پر چڑھائیں پھر جو تلفظ ان الفاظ کا کریں ان کو سن کر محفوظ کر لو اور سمجھو کہ انگریزی زبان کے الفاظ اپنی زبان میں داخل کرنیکا یہی موزوں اور مناسب طریقہ ہے۔

اس موقع پر اگر میں یہ کہوں کہ یہ بزرگوار زبان کا صحیح ذوق نہیں رکھتے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ ان بزرگواروں کو جاننا چاہیئے کہ انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر اور جاہلوں کی زبان کی خراد پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کریں، تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ ان حضرات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر مہذب اور شائستہ زبان میں ایسے الفاظ جو اجنبی زبانوں سے لہجہ یا تلفظ کی تبدیلی یا حروف کی کمی بیشی کے ساتھ لئے جاتے ہیں، بمقابلہ اس زبان کے اصلی الفاظ کے بہت کم ہوتے ہیں۔ کسی متمدن قوم کی زبان ان الفاظ کی کثرت کو برداشت نہیں کر سکتی اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش

خراش کیوں نہ کی جائے، ان میں اجنبیت کی بو اس قدر رہتی ہے کہ اہل زبان اُن سے مانوس نہیں ہوتے۔ ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اُس میں بھر دے جائیں تو اُن کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اور ہماری زبان کی لچک اور نزاکت سب ملیامیٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے، جسکے الفاظ کا کوئی جز گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلہ میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزا پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں فرق آئیگا، اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے جرم کے مرتکب ہونگے۔

وضع اصطلاحات کے متعلق عام فیصلہ

خدا کا شکر ہے کہ جامعۂ عثمانیہ دکن کی اُس جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق رکھنے والے بزرگ شامل تھے، یہ اہم مسئلہ کثرتِ رائے سے طے کر دیا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لیجائیں بلکہ انگریزی علمی اصطلاحات کے مقابلہ میں اردو علمی اصطلاحات وضع کیجائیں

اس بنا پر اُن حضرات کے خیالات، جو اصطلاح سازی کے مخالف ہیں، اب زیادہ قابل توجہ اور لایق بحث نہیں رہے۔

اصطلاح سازی کے دو بڑے گرو

اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد، یہ اہم بالشان بحث پیش آتی ہے کہ اگر ہم اصطلاحیں بنائیں تو کس اصول کے مطابق بنائیں اس مرحلہ پر پہنچکر اصطلاح سازوں کے دو بڑے گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ تمام اصطلاحی الفاظ عربی زبان سے بنانے چاہئیں۔ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ اصطلاحات کے وضع کرنے میں ان تمام زبانوں کے لفظوں سے کام لینا چاہیئے جو اردو زبان میں بطور عنصر کے شامل ہیں (یعنی عربی، فارسی، ہندی) اور اُن لفظوں کی ترکیب میں اُردو گرامر سے مدد لینی چاہیئے۔

نیشنل پریس الہ آباد میں باہتمام رمضان علی شاہ چھپا

رُوحِ نظیر

یعنی

میاں نظیر اکبر آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ

جناب جی الا ! رُوحِ نظیر جس کو سید محمد محمود رضوی بی اے محمود اکبر آبادی نے مع ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ کے نہایت کاوش و تحقیق سے مرتب کیا ہی چھپکر تیار ہو گئی ہے۔ علاوہ ایک پُر مغز دیباچہ اور ایک پُر معنی مقدمہ و تبصرہ کے جن سے نظیر کے شاعرانہ کمال پر تحقیقی روشنی پڑتی ہے کتاب کے آخر میں فرہنگ و حواشی اضافہ کرکے کلام کی معنوی مشکلات و تلمیحات کو حل کیا ہے اور اسکے ساتھ متروکات و مصطلحات پر گہری نظر ڈالی ہے کلام نظیر کی صحت میں جس دقت نظر سے کام لیا گیا ہے وہ صرف مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب معنوی لطائف کے علاوہ صوری محاسن کا ایک نظر فریب مرقع ہے۔ اسکی ترتیب جو بالکل جدید انداز و طریق ادارت پر کی گئی ہے۔ دلدادگان ادب کے لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۴۰۰ صفحہ سرورق رنگین کاغذ چکنا ولایتی ۲۸ پونڈ کتابت و طباعت دیدہ زیب ہندوستان کے تمام مشہور و معتبر اخباروں نے اسکی بیحد تعریف کی ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک عہ

ملنے کا پتہ:- رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش چوک آگرہ